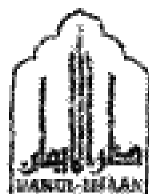
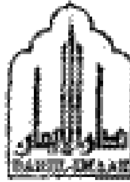
آئینہ ایمان

تالیف

حضرت مولانا سید مفتی مختار الدین صاحب مدظلہ کربوغہ شریف

خلیفہ مجاز برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی
نور اللہ مرقدہ





نام کتاب..............آئینہ ایمان

مصنف..............حضرت مولانا مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب مدظلہ

طبع..............سوم مارچ 2008ء

باہتمام..............دارالایمان راولپنڈی

قیمت.............. 140

ملنے کے پتے

۱۔ دارالایمان نزد مسجد صدیق اکبر اللہ آباد ویسٹرج 3 راولپنڈی

051-8004730 —— 0321-2032856

۲۔ مکتبہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

۳۔ جامعہ زکریا دارالایمان کربوغہ شریف ضلع ہنگو 0925-662313

۴۔ جامع مسجد مومن، صاحبزادہ گل روڈ باڑہ شاپ صدر پشاور

0300-5980769

۵۔ ادارہ اسلامیات انارکلی اردو بازار لاہور

۶۔ مکتبہ مدنیہ اردو بازار لاہور

۷۔ مکتبۃ الاسلام اعظم مارکیٹ کمیٹی چوک راولپنڈی 0333-5178392

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حسن جان صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

جامعہ امداد العلوم الاسلامیہ، پشاور صدر، پاکستان

رکن اسلامی نظریاتی کونسل، اسلامی جمہوریہ پاکستان

الحمد لولیہ، والصلاۃ والسلام علیٰ نبیہ، وعلیٰ آلہ وصحبہ، وبعد

پیش نظر رسالہ " آئینہ ایمان " مؤلفہ برادر محترم حضرت مولانا مفتی صاحبزادہ مختار الدین صاحب آف کربوغہ شریف، ضلع کوہاٹ۔ روحانی تعلیمات اور اسلام کے بنیادی ارکان اور ایمانی روشنی کا مینار اور مشعل راہ ہے اور تربیت روح اور جسد کا حسین مرقع ہے۔ موصوف کے جملہ رسائل اور تصنیفات قابل مطالعہ اور استفادہ ہیں اور مسلک صحیح اہل سنت والجماعت کی ترجمان ہیں۔ مضامین کے عنوانات سے ابتدائی طور پر قارئین حضرات کو رسالہ " آئینہ ایمان " کی اہمیت اور افادیت اور ضرورت معلوم ہو جاتی ہے اور پڑھنے کے بعد نہایت سودمند ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے موصوف کا یہ رسالہ اور جملہ تصانیف قبول فرما کر، ان کے لئے ذخیرۂ آخرت اور پڑھنے والوں کے لئے وسیلہ تربیت اور اصلاح بناوے۔ آمین

محمد حسن جان

پشاور صدر۔ ۱۷۔۶۔۱۴۲۰ھ

تقریظ

شیخ الحدیث مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی

بانی و مہتمم جامعہ عثمانیہ نوتھیہ روڈ، پشاور صدر

زیر نظر کتاب ''آئینہ ایمان'' حضرت مولانا مفتی مختار الدین دامت حیاتہٗ و برکاتہٗ کی گرانقدر محنت اور ثمر آور کوشش کا ایک نمونہ ہے۔ موصوف اسلام کے بنیادی عقائد پر سیر حاصل بحث کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلامی معاشرہ میں کسی مصنوعی یا عارضی بنیادوں پر تبدیلی کے بجائے مستقل طور پر مستحکم تبدیلی کے قائل ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جہاں کہیں عقائد پر محنت ہو کر استقامت نصیب ہو تو اس سے معرض وجود میں آنے والا معاشرہ دور رس اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ ورنہ خود ساختہ اور نام نہاد تقویٰ کا سفر محدود رہتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب پر چونکہ برکۃ العصر قطب عالم حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا رنگ غالب ہے اس لئے آپ نے علمی اور تحقیقی اعتبار سے معاشرے کی تشخیص کر کے اصلاحی اور عملی لحاظ سے مؤثر علاج تجویز کیا ہے۔ تاہم جس معاشرہ کے انحطاط اور زوال پذیر ہونے کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ اس میں ''پختون معاشرہ'' کے رسم و رواج اور علاقائی عادات کا بڑا دخل ہے۔ جس میں اسلام کے بنیادی عقائد سے ناواقفیت کی وجہ سے معاشرہ میں ایسے رسوم رواج پا گئے ہیں جن کا اسلام سے دور کا تعلق نہیں۔ اس کی اصلاح کے لئے قرآن و حدیث کا سہارا واحد ذریعہ علاج ہے۔

بحمد للہ موصوف کی کتاب راہ حق کی تلاش میں اسلامی عقائد کی دلنشین اور آسان تشریح کی وجہ سے مشعل راہ ہے۔ جس کی وجہ سے تاریک معاشرہ میں مسلمان اپنی منزل آسانی سے تلاش کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کی یہ محنت قبول فرمائے۔

غلام الرحمٰن عفی عنہ

۱۹/۶/۱۴۳۰ھ

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد امین صاحب دامت برکاتہم

شاہو دام، ہنگو

ہر ذی عقل جانتا ہے کہ ایمان اور عقیدہ کا انسان کے عمل و کردار سے انتہائی گہرا تعلق ہے یہاں تک کہ بعض حلقوں نے ایمان و عمل کو ایک ہی چیز قرار دیا اور ایک عظیم گروہ نے عمل کو ایمانی حقیقت کا جزو تسلیم کیا۔ کتاب و سنت کی بے شمار نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اعمال کے لئے جڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحیح عقیدہ اور کامل ایمان سے اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی شاخیں پھیلتی ہیں۔ اخلاق حسنہ اور پائیدار صالح کردار صحیح عقیدہ و ایمان کے بغیر متصور نہیں۔ قرآن حکیم کے تمام اوامر و نواہی کے سیاق و سباق میں ایمان کا ذکر اسی بناء پر فرمایا گیا ہے اور احادیث نبویہ میں اچھے اعمال کا اثبات جن کے لئے کیا گیا ہے اور برے اخلاق و اعمال کی نفی جن سے فرمائی گئی ہے انہیں عموماً مومن کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

ایمان کی اسی اہمیت کی وجہ سے علماء سلف نے اپنی کتابوں میں عقیدہ اور ایمان کو اولیت بخشی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، ابوبکر بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ، امام جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ، ابن مندہ امام ابو منصور بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، حلیمی رحمۃ اللہ علیہ، امام النامی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ اکبر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسی معرفت کے عظیم آفتاب و ماہتاب شخصیات نے اس موضوع پر مستقل تالیفات چھوڑی ہیں اور مشہور محدث وفقیہ و متکلم امام حافظ ابوبکر البیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان کے نام سے وہ بے مثال کتاب لکھی جس کا صفحہ صفحہ بلکہ سطر سطر کے مطالعہ سے ایمان میں تازگی اور پائیدگی پیدا ہوتی ہے۔

اللہ جل شانہٗ ہمارے مخدوم و مکرم، شیخ اور عالم، عارف محقق حضرت مولانا مفتی

مختار الدین صاحب دامت برکاتہم کو جزائے خیر سے نوازے اور آپ کی عمر میں برکت نازل فرمائے اور آپ کے علوم و معارف سے امت کو پیش از پیش نفع پہنچائے۔ آپ نے اپنے دلکش پیرایہ میں سلیس اور عام فہم انداز تعبیر کے ساتھ "آئینہ ایمان" نامی کتاب نہایت مفید تالیف فرما کر وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ اصلاحی تقریر و تحریر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ترغیب و تربیت کے نقطہ نظر سے لکھی گئی کتابوں میں فقہاء کرام کی طرح محتاط تعبیرات کی نہ کما حقہ رعایت کی جاسکتی ہے اور نہ ایسی تعبیرات مفید مقصد ہوتی ہیں اس لئے اس بابرکت تحریر کو اسی آئینہ میں دیکھا جائے ناظرین کرام اگر کہیں کچھ شدت محسوس کریں تو وہ اسی کا نتیجہ سمجھ لیں۔ واللہ سبحانہ ولی التوفیق

محمد امین شاہو دام عنگو

پیش لفظ

الحمد للہ و کفیٰ والصلوٰۃ و السلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ اما بعد

کائنات کا ہر ذرہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے وہی اسکا مالک ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تمام مخلوقات اور خود انسان کے اپنے اعضاء و جوارح اور اوصاف کو بھی انسان ہی کی ترقی اور مفاد کے لئے بنایا ہے یہ تمام چیزیں انسان کے لئے لذت، راحت، عزت وصحت اور ترقی کا سامان بن جاتی ہیں۔

جس طرح انسان کے لئے ان اسباب عزت، لذت وراحت کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ظاہر ہے کہ اسی طرح ان کے خواص وتاثیرات کا بھی صرف وہی خالق ومالک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے ان چیزوں سے نفع اٹھانے کے قوانین بھی مقرر کر رکھے ہیں جن میں سے بیشتر کو انسانوں نے دریافت کیا ہے مثلاً یہ کہ مرغی کا گوشت یرقان کے لئے مضر ہے۔ تو اب اگر یرقان کا مریض گوشت کھائے تو وہ عارضی لذت تو حاصل کرے گا۔ لیکن صحت اور جسمانی نفع سے محروم رہے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں (خواہ وہ انسان کے اندر ہیں مثلاً آنکھ، ناک، عقل وغیرہ یا باہر ہیں مثلاً آگ، پانی، مال، دولت، پھل اور پھول) ان تمام چیزوں کے حصول اور ان کے استعمال کے لئے قوانین مقرر فرمائے ہیں۔ چنانچہ یہ چیزیں اگر اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق حاصل ہوں اور اسی کے مقرر کردہ قوانین اور حکم کے مطابق استعمال بھی ہوں تو ان سے نفع کی صورتیں پیدا ہوں گی اور اگر اس کے قانون اور حکم کی خلاف ورزی اس میں شامل ہو جائے تو اسکا نتیجہ نقصان اور خسران کی صورت میں سامنے آئے گا۔ بہرحال جب انسان اس حقیقت کو پالے کہ نفع ونقصان، عزت وذلت کا مالک صرف اور صرف ایک اللہ رب العالمین ہے اور حقیقی ودائمی نفع وعزت صرف اللہ تعالیٰ کے قانون وحکم کے مطابق ہی چل کر ملتی ہے اور اس کے حکم کی خلاف ورزی میں سراسر نقصان ہے۔ تو پھر اس کی تمام امیدیں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم کے مطابق چلنے کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور اس کا خوف صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون و

حکم کی خلاف ورزی سے ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہی سے لرزاں وترساں رہتا ہے۔ اور اسی طرح اس کے خوف اور امید کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بن جاتی ہے اور وہ ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اسکی بندگی کو اختیار کر لیتا ہے اور یہی وہ صحیح تعلق ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکامات کی اطاعت بجالاتے ہوئے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال رحم وکرم، عدل، سچائی اور امانت داری، عفت وحیاء وغیرہ جیسے عظیم اخلاق کا پیکر بن جاتا ہے اور جس شخص کا یہ تعلق اور رابطہ صحیح نہ ہو اور دنیا کی عارضی لذتوں، راحتوں وغیرہ پر فریفتہ ہو تو وہ انسانی صورت میں ایک جانور ہوتا ہے جس کا تعلق ہوائے نفس سے اور جس کا رابطہ شیطان سے ہوتا ہے تو ایسے شخص میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے برعکس شیطانی صفات مثلاً خود غرضی، بے رحمی، ظلم، خیانت، بے صبری، ناشکری وغیرہ جیسے رذائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

پہلا شخص مومن اور رحمٰن کا بندہ ہوتا ہے اور یہ دوسرا شخص بے ایمان اور شیطان کا بندہ کہلاتا ہے بہر حال جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق صحیح ہو اور اس کی بندگی کو سچائی سے اپنایا جائے تو اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات میں رنگ جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً

"یعنی (کہو ہم نے لیا) اللہ تعالیٰ کا رنگ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔" (بقرہ۔ آیت ۱۳۸)

اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا وہ رنگ ہے جو اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی اور کامل سپردگی سے چڑھتا ہے۔ جس کے بعد انسان کی چال ڈھال، گفتار و کردار غرض پوری زندگی رحمٰن کے رنگ میں رنگ جاتی ہے اور اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور وہی اس کا کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے اور وہی اس کا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے اور وہی اس کا پاؤں بن جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے۔ غرض وہ اللہ تعالیٰ کی صفات رحم، عدل وغیرہ میں خوب رنگ جاتا ہے

(تفصیل کے لئے دیکھیں مشکوٰۃ باب ذکراللہ عزوجل والتقرب الیہ بحوالہ بخاری)

اور اسی رنگ کو اپنانے کی تعلیم خود نبی کریم ﷺ نے یوں دی ہے کہ "تخلقوا باخلاق اللہ" "اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے اخلاق پیدا کرو"

یہی وہ انسان ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ خلافت اور نیابت صفات کی بنیاد پر ہوتی ہے اور یہی لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے دنیا میں جنتی معاشرہ وجود میں آجاتا ہے اور یہی لوگ ہوتے ہیں جو خود بھی رحم وعدل، امانت داری، حیاء ،عفت، سخاوت وغیرہ جیسی صفات پر چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی لوگ ہوتے ہیں جنکے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ کا قانون اور شریعت آجائے تو اس سے نظام خلافت وجود پذیر ہوتا ہے۔

اگر یہ صفات اور اخلاق نہ ہوں تو پھر یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور رابطہ صحیح نہیں یا حقیقی ایمان نہیں بلکہ رسمی ایمان ہے چنانچہ انکی عبادات حقیقی نماز روزہ وغیرہ نہیں بلکہ بے جان اعمال ورسوم ہیں جن پر وہ عمل پیرا ہیں۔ ایسے لوگ دعویٰ ایمان کے باوجود بے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے دعوے کے باوجود شیطان کے بندے اور اس کے چیلے ہوتے ہیں۔ چونکہ عصر حاضر میں ایمان واسلام کو صرف چند ظاہری اعمال ورسوم کا مجموعہ سمجھ لیا گیا ہے اور لوگوں کی اکثریت اسلام کے بنیادی امور اور بنیادی مقاصد اور ایمان کی صفات سے غافل ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ رحمٰن کے بندوں کی صفات واخلاق یا بالفاظ دیگر ایمانی صفات سامنے لائی جائیں تاکہ ہر مسلمان اپنے متعلق غلط اور بے جا خوش فہمی اور جھوٹی امیدوں میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنی زندگی کو ایمان کی مضبوط بنیادوں پر استوار کرے اور اللہ تعالیٰ کی سچی بندگی اپنا کر دنیا وآخرت میں کامیاب ہوجائے بلاشبہ یہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر چل کر انسان اپنی منزل مقصود کو پہنچ کر فلاح پاسکتا ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعہ و ارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابہ

بندہ مختار الدین کربوغہ شریف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز کتاب

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ و السلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ

انسان اگر اپنے اندر اور اپنے باہر پھیلی ہوئی کائنات میں ادنیٰ سا بھی غور وفکر کرے تو وہ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے گا کہ یہ وسیع وعریض کائنات اسی کے لئے بنائی گئی ہے اور اسی کے لئے مسخر کی گئی ہے اور میں ان کی بجائے اس ذات کے لئے ہوں جس نے میرے لئے یہ کائنات اور یہ چیزیں پیدا کی ہیں نیز اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک ہی ذات ہے جو اپنی ذات وصفات اور اختیارات میں بھی یکتا ہے کیونکہ دنیا کی تمام متضاد چیزیں دن رات، آسمان وزمین اور ان میں پھیلی ہوئی تمام چیزیں صرف ایک ارادہ کے تحت چل کر ایک ہی مقصد کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں اور سب کی سب مل کر اپنے سے بعد میں آنے والی کمزور مخلوق یعنی انسان کے مفادات کے لئے کام کر رہی ہیں اور یہ اتنی سیدھی سادی بات ہے کہ یہ تمام چیزیں مخلوق ہیں مسخر ہیں۔ اپنے خالق کے قانون کی پابند ہیں اور اس کائنات کا خالق ایک اور صفات واختیارات میں یکتا ہے پس جب کوئی شے اپنے صانع کی صفات اور اس کے اختیارات میں شریک اور حصہ دار نہیں ہو سکتی جبکہ یہ دونوں مخلوق ہیں تو ایک مخلوق کس طرح اپنے خالق کی صفات واختیارات میں شریک اور حصہ دار ہو سکتی ہے؟

کائنات میں غور وفکر کے بعد:

اسی طرح رنگا رنگ عجائب قدرت کا نظارہ اور ان میں فکر وتدبر انسان کو یہ اعتقاد بخشتا ہے کہ اس کارخانے کا ایک قدیم اور ازلی خالق ہے۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کا وجود حتمی اور یقینی ہے اور اس کا معدوم ہونا محال ہے وہ ذات وصفات کے لحاظ سے ایک اور یکتا ہے اس کی ذات وصفات اور اس کے اختیارات میں کوئی شریک نہ آسمانوں میں ہے اور نہ ہی زمین میں، صرف وہی تمام صفات کمال سے متصف اور تمام خوبیوں اور

کمالات کا جامع ہے اور وہی ذات تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے نہ وہ کسی چیز کا جزو اور اقنوم ہے اور نہ اس سے کوئی چیز جزو اور اقنوم ہو سکتی ہے۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ باپ نہ کوئی اور رشتہ دار بلکہ اس کے سوا سب کچھ اس کی مخلوق ہے اور سب کچھ اس کے ارادے سے پیدا ہوا ہے اور اسی کے ارادے سے قائم ہے۔ پوری کائنات کی تدبیر و انتظام میں اس کا کوئی شریک و مددگار نہیں اس کی قدرت بے انتہا ہے اسکا علم و مشاہدہ لامحدود ہے اس کے سمع و بصر نے پوری کائنات کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ تمام معلومات اس کے علم اور مشاہدے میں ہیں اور دنیا میں کوئی چیز نہیں جو اس کا احاطہ کر سکے نہ کسی میں وہ حلول کرتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی حلول کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ کسی کے ساتھ اتحاد کرتا ہے۔

دنیا میں جو خوبی و کمال اور حسن و جمال نظر آ رہا ہے وہ اس کی صفات کمال کی تجلیات ہیں جو پردہ کائنات پر نظر آ رہی ہیں پوری کائنات کی تدبیر و انتظام میں اس کا کوئی شریک و مددگار نہیں اس کا تصرف نہ کبھی پہلے باطل ہوا اور نہ آئندہ باطل ہوگا۔ ہر چیز اس کی وجہ سے قائم ہے اور اسے اسی ذات سے زندگی ملتی ہے اور اسی کے مقررہ قوانین کے مطابق قوموں کو عروج و زوال ملتا ہے اس پر نہ موت طاری ہوتی ہے نہ نیند اور اونگھ، تمام مخلوقات یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی پیدائش و بقاء اور اپنی نشو و نما و تربیت اور ترقی میں ہر آن صرف اسی کی مدد اور صرف اسی کے سہارے کا محتاج ہے اور وہ خود کسی کے سہارے اور مدد کا محتاج نہیں ہے۔ اس ذات پر اور اس کی لامحدود صفات کمال پر نہ کبھی زوال آ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نقصان۔ اس کے تمام افعال اس کے ارادے سے صادر ہوتے ہیں نہ کہ اضطراری طور پر۔ اس کی صفات کسی بھی وقت معطل نہیں ہوتیں اس کا ہر قانون حکمت، رحمت اور عدل پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے ہر فعل اور ہر کام میں حکمت اور رحمتیں پنہاں رہتی ہیں۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ نے با مقصد اور حکمت سے بنائی ہے۔ اس کا کوئی کام عبث و بیکار نہیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے آگ، پانی وغیرہ میں خاصیتیں رکھی ہیں اس طرح کی خاصیتیں انسان کی سوچ، فکر، جذبات، اس کے ارادے، اس کے قول و فعل اور کردار میں بھی ہیں۔ اور ہر شخص کو اپنا کیا ہوا ملتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کائنات میں غور و فکر کر کے یہ حقیقت جان لیتا

ہے کہ جب تمام مخلوقات بے مقصد اور بے فائدہ پیدا نہیں کی گئیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی خلقت میں بے شمار مصالح پوشیدہ ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ اس مخلوق کو جو ان سب کی مخدوم ہے قدرت نے بے مقصد اور لایعنی پیدا کیا ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ

"پس کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹو گے۔" (مومنون۔ آیت ۱۱۵)

پس یقیناً اس کا ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ میں اس خالق کے لئے اور اس کی بندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں جس نے تمام چیزیں میرے لئے بنائی ہیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

"اور میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔" (الذٰریات۔ آیت ۵۶)

نیز یہ دنیا کوئی مداری کا کھیل تماشہ نہیں بلکہ اسکا ایک مقصد ہے وہ یہ کہ دنیا میں انسان اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کر کے اپنی دائمی زندگی (آخرت) کو خوشگوار بنائے۔ اس حقیقت کو پالینے کے بعد انسان کسی مخلوق کی بندگی نہیں کر سکتا نہ نفس کی، نہ انسانوں کی اور نہ انسانوں کے علاوہ کسی دوسری مخلوق مثلاً فرشتوں وغیرہ کی۔ چنانچہ وہ دنیا میں ایک مسافر کی طرح وقت گزارتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" "دنیا میں ایسے رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ گزر۔"

اور یقیناً یہ دنیا ہے بھی ایک راہ گزر اس لیے دنیا میں رہتے ہوئے اور دنیا کی چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے بھی اس کا دل اللہ تعالیٰ اور آخرت کے ساتھ اٹکا رہتا ہے اور دنیا کی چیزوں کی خاطر نہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا چاہتا ہے اور نہ اتنا احمق ہوتا ہے کہ عارضی خوشی کے لئے آخرت کی دائمی و ابدی خوشی، راحت، آرام اور لذتوں کو نظر انداز کر کے اپنی مسلسل اور آگے ترقی کرنے والی زندگی کو تباہ و برباد کر دے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو آسمان و زمین میں غور کرنے سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور انہی

کی تفصیل وتشریح وحی الٰہی کرتی ہے یہی حقائق انسان کی فطرت کے بھی عین مطابق ہیں اور انہی حقیقتوں پر مبنی انسانی زندگی کا فطری نظام انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں جس کا نام اسلام ہے اور اس کی آخری شکل کامل ومکمل صورت میں محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی اور یہی وہ اسلام ہے جس کو کامل ومکمل طور پر اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اسکی بندگی کہلاتا ہے اور یہی وہ اسلام ہے جس میں نہ تبدیلی کی گنجائش ہے نہ اس میں تحریف ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس میں کمی بیشی کا امکان ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد

(۱) وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ

''بلکہ نیکی تو ان لوگوں کی ہے جو ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر اور پیغمبروں پر'' (بقرہ۔آیت ۱۷۷)

(۲) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۚ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

''اور ایمان لائے رسول اس پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس پر مومن لوگ بھی ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اسکے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر'' (بقرۃ آیت ۲۸۵)

(۳) وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا

''اور جس شخص نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اسکی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو (وہ صحیح راہ سے بھٹک کر) دور کی گمراہی میں جا پڑا'' (نساء۔آیت ۱۳۶)

بنیادی عقائد پانچ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان (۲) اس کے ملائکہ یعنی فرشتوں پر ایمان (۳) اللہ تعالیٰ کی

کتابوں پر ایمان (۴) اللہ تعالیٰ کے نبیوں پر ایمان (۵) روز آخرت پر ایمان

ان پانچ امور کے اندر اسلام کے تمام عقائد و نظریات آجاتے ہیں مثلاً ''تقدیر''۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم و حکمت وقدرت کے ساتھ لازم ہے اس کی نفی العیاذ باللہ، اللہ کے علم و حکمت اور قدرت کو محدود کرنا ہے۔ اب عقائد کی ضروری تفصیل کو سمجھ لیجئے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا خلاصہ:

انسان اس بات کو تسلیم کرے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اور تمام کائنات میں صرف اسی کی مشیت اور قانون مشیت چل رہا ہے۔ صرف وہی نفع ونقصان ،عزت وذلت کا مالک ہے اور حقیقی نفع وعزت اور خیر صرف اللہ تعالیٰ کے قانون و حکم کے مطابق چلنے (یعنی بندگی) میں ہے اور اس کے خلاف سراسر نقصان وخسران ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا اثر:

۱۔ اس عقیدے کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ایسے شخص کا اللہ تعالیٰ اور اس کے ہر قانون، ہر حکم اور ہر بات وہدایت پر کامل اعتماد و بھروسہ ہوگا۔

۲۔ ایسا شخص کامل طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون واحکامات وہدایات کے حوالے ہو جاتا ہے اور صرف اس کی بندگی کرتا ہے اور صرف ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اپنا نصب العین بنالیتا ہے۔

۳۔ وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ اور اس کی خوشنودی کو چاہے گا صرف اسی سے اور اس کے احکامات وہدایات پر چلنے میں نفع وخیر کی امید رکھے گا۔ اور صرف اسی سے اور اس کے قانون و حکم کی خلاف ورزی سے ڈرے گا اور صرف اسی سے مانگے گا اس طرح اس کے طمع وخوف، امید وبیم کا مرکز ومرجع اور معبود صرف ایک اللہ رب العالمین کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے قانون کے مقابلے میں دوسروں کے قوانین پر اعتماد کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کے بجائے دوسروں کے قوانین کی خلاف ورزی کو باعث نقصان وخسران سمجھتا ہے یا

خوف وامید کی حالتوں میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو ذرہ برابر بھی نفع ونقصان کا مالک سمجھتا ہے تو ایسا شخص دعویٰ ایمان کے باوجود ایمان سے خالی اور اپنے دعویٰ ایمان میں جھوٹا ہے۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب

فرشتوں کی حقیقت:

یہ اللہ تعالیٰ کی وہ نورانی اور لطیف مخلوق ہیں۔ جو عام طور پر نظر نہیں آتے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے کائنات کے نظم ونسق، آسمان وزمین کی تمام چیزوں پر اور جنت وجہنم پر مقرر فرمایا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اسکی قضاء وقدر کے منصوبوں اور اسکیموں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ اور کارندے ہیں۔

فرشتے بے اختیار ہیں:

ان کے اندر برائی اور نافرمانی کا مادہ نہیں رکھا گیا۔ ان کے پاس ذرہ برابر بھی اختیار نہیں، اور نہ ہوسکتا ہے۔ نہ وہ اپنی مرضی سے کچھ کرسکتے ہیں۔ اس لئے یہ ملکوتی قوتیں بلا چون وچرا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قانون وحکم کے تحت چلتی ہیں۔ اور ہر آن سرگرم عمل رہتی ہیں۔ فرشتوں کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ

وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور صرف وہی کرتے ہیں۔ جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ (تحریم۔ آیت ۶)

فرشتوں کی مختلف جماعتیں ہیں:

کائنات کے نظم ونسق چلانے کے لئے فرشتوں کی مختلف جماعتیں ہیں۔ اور ہر ایک کے لئے ایک کام مقرر ہے۔ وہ صرف اسی کام پر لگا رہتا ہے۔ وہ اپنے کام میں ذرہ برابر خیانت نہیں کرتے۔ اور نہ کاہل نگاری سے کام لیتے ہیں جیسے کہ جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغام واحکامات پیغمبروں کے پاس لاتے تھے۔

فرشتے انسانوں کے اعمال کے نتائج مرتب کرتے ہیں:

اسی طرح بعض فرشتے انسان کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ جیسے کراماً کاتبین جن میں سے ایک فرشتہ نیک کام لکھتا ہے اور دوسرا فرشتہ برے کام لکھتا ہے۔ اسی طرح یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہر عمل کا نتیجہ مرتب کرتے ہیں۔ اور وہ نتیجہ انسان کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور یہی اعمال قانون الٰہی کے مطابق مستقبل میں نفع و خیر یا نقصان و خسران کی صورتوں میں سامنے آجاتے ہیں۔

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ

ترجمہ: اور بے شک تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے، وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ (انفطار۔ آیت ۱۰ تا ۱۲)

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ

"یعنی جب کہ دو فرشتے (انسان کے اقوال و افعال کو) لینے (ضبط و ریکارڈ کرنے) والے (ہر وقت انسان کے) دائیں بائیں بیٹھے رہتے ہیں وہ انسان جو بھی لفظ بولتا ہے۔ تو اس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔ (کہ ادھر اس کی زبان سے کوئی لفظ نکلا اور ادھر فوراً ایک محافظ اور نگران نے محفوظ کر لیا۔ کیا مجال کہ کوئی ایک عمل اور ایک لفظ بھی ریکارڈ سے اور اپنے نتیجہ خیزی سے رہ سکے)(سورۃ ق۔ آیت ۱۷ تا ۱۸)

اسی طرح بعض فرشتے ایسے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق آفتوں اور مضر اثرات سے انسان کی حفاظت کرنے پر مقرر ہیں۔

کچھ فرشتے انسان کے مرنے کے بعد قبر و برزخ میں اس سے سوال کرنے پر مقرر ہیں۔ ہر انسان کی قبر اور برزخ کی زندگی میں دو فرشتے آتے ہیں۔ جنہیں منکر نکیر کہا جاتا ہے۔

غرض یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین، جنت و جہنم کے انتظامات پر فرشتوں کو مقرر فرمایا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنا کام پورا کرتے ہیں۔ اس کام

میں وہ کسی طرح خودمختار نہیں ہوتے ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جو کام جس طرح چاہے اسی طرح اس کے حکم کے مطابق کر دیتے ہیں۔

فرشتوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ چار مقرب اور مشہور فرشتے ہیں۔

اول حضرت جبرئیل علیہ السلام، دوسرے حضرت میکائیل علیہ السلام، تیسرے حضرت عزرائیل علیہ السلام اور چوتھے حضرت اسرافیل علیہ السلام۔

فرشتوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

فرشتوں پر ایمان کے بارے میں بعض ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ حقائق تو بے شمار ہیں۔ لیکن ایمانیات کے اندر وہی حقائق ہونے چاہئیں۔ جن کی وجہ سے انسان کی زندگی پر مفید اثرات مرتب ہوسکیں۔ تو آخر فرشتوں کے وجود پر ایمان لانے کی وجہ سے انسان کی زندگی اور عمل میں کیا فرق آسکتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ فرشتے چونکہ اقوام عالم کے نزدیک ایک مسلم حقیقت ہیں اور شروع سے آج تک تمام لوگ ان کو کسی نہ کسی صورت میں مانتے آئے ہیں۔ اس لئے آسمانی کتابوں اور قرآن مجید میں بھی اس حقیقت کو سامنے لایا گیا اور ان فرشتوں کے متعلق جو غلط عقائد ونظریات تھے انھیں دور کر کے فرشتوں کی صحیح حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اور اگر اس کے باوجود یہ کہا جائے کہ یہ تو ان کے وجود اور حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے وجود کا ہی قائل نہ ہو۔ تو اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا۔ کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر اور جاہل ہے۔ باقی رہا کہ اس کی علمی اور عملی زندگی پر اس کے کیا برے نتائج مرتب ہوسکتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کی حقیقت پر ایمان لانے سے انسان کی علمی اور عملی زندگی پر بہت مفید اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔ لہذا اس حقیقت سے انکار کی صورت میں وہ شخص ان تمام مفید اثرات سے محروم رہے گا۔

فرشتوں پر ایمان لانے کے اثرات و نتائج:

(ا) مادہ پرست لوگ مادی چیزوں کے خواص اور طبائع کو دیکھ کر، انہی مادی خواص اور طبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں۔ اور بے اختیار مادہ ہی کو سب کچھ جان کر اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان مادی خواص و طبائع پر روحانی قوتیں مقرر ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے مقررہ اصول کے مطابق نظام عالم کو چلا رہی ہیں۔ اس حقیقت کو ذہن کے قریب کرنے کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان وغیرہ کو پیدا کیا۔ ان میں سے ہر عضو میں اللہ تعالیٰ نے کچھ خاصیتیں اور قوتیں رکھ دی ہیں۔ مثلاً ہاتھ میں پکڑنے کی قوت آنکھ میں دیکھنے اور کان میں سننے کی قوت رکھ دی ہے۔ لیکن یہ قوتیں اس وقت تک از خود ذرہ برابر بھی کوئی حرکت نہیں کر سکتیں جب تک ان چیزوں کو حرکت دینے والی چیز یعنی حیوانی روح موجود نہ ہو۔ اور یہی روح حیوانی انسان کے پورے مادی جسم پر مسلط رہتی ہے۔ اور آنکھ سے دیکھنے، کانوں سے سننے، ہاتھ سے پکڑنے اور پاؤں سے چلنے، غرض ایک ایک چیز کو اسکی خاصیت وطبع کے مقررہ قانون کے مطابق چلاتی رہتی ہے۔ اگر یہ روح نہیں تو پکڑنے یا بینائی کی قوت ہونے کے باوجود یہ قوتیں بے حس وحرکت ہو کر ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ یہ حیوانی روح انسان کے ارادے کے مطابق ان اعضاء کو چلاتی رہتی ہے۔ اور یہ حیوانی روح قطعاً کوئی اختیار نہیں رکھتی کہ اختیاری اعمال میں وہ ذرہ برابر انسان کی نافرمانی کرے۔ ایک طرف تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کے ارادے کی تابع ہے۔ اور اس کے ارادی اعمال میں ارادہ کو پا کر اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اور جو انسان کے غیر اختیاری اعمال ہیں مثلاً بڑھنا، کمزور ہونا، موٹا ہونا وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون کے مطابق سرانجام دیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مادہ، پتھروں، پہاڑوں، چاند، سورج، حتیٰ کہ ہر مادہ میں جو قوتیں اور جو خاصیتیں رکھی ہیں ان پر بھی ارواح یعنی ملائکہ مقرر کئے ہیں۔ وہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے مقررہ اصولوں کے مطابق چلاتے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ فرشتے ایک طرف تو انسان کے سامنے چیزوں کو

پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کے حصول و استعمال میں اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون کے مطابق نتائج مرتب کرتے ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید نے ملائکہ کی حقیقت کو سامنے لا کر ایک طرف ان لوگوں کے غلط عقائد کو مٹا دیا جو فرشتوں کو خدائی اختیارات دے دیتے ہیں۔ دوسری طرف مادیت کے بت کو بھی پاش پاش کر دیا اور بتایا کہ یہ مادہ اور خواص بالذات موثر نہیں بلکہ کوئی دوسری ذات ہے جو ارواح مجردہ یعنی ملائکہ کے ذریعے ان کو موثر بناتی ہے اور چلاتی ہے اگر یہ ذات نہ ہو تو یہ تمام قوتیں بے حس و حرکت ہو کر ناکارہ ہو کر رہ جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتوں کو ماننے والا مادی قوتوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی نافرمانی سے خوفزدہ ہوتا ہے کیونکہ مادی قوتوں کو چلانے والے فرشتے اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کے ماتحت چلتے ہیں۔

(۲) جب اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات رحم و عدل اور حکمت پر ایمان لانے کے ساتھ یہ لازم ہے کہ اعمال کے نتائج کے لئے روز آخرت اور دوسری زندگی بھی ہو تو اب سوال یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں عروج و ترقی اور آخرت کی ابدی فلاح و ترقیات کو کیسے حاصل کیا جائے۔ ظاہر ہے وہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات کے قانون اور اس کی خالص بندگی سے ہی حاصل ہوگی۔ اور اس بندگی اور اللہ تعالیٰ کے احکامات، قوانین و ہدایات کے لئے کتابوں اور کتابوں کے بتانے اور سمجھانے کے لئے رسولوں کی ضرورت ہوئی۔ پس جب انسان کی ترقی اور فلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رہنمائی ضروری ہوئی تو ظاہر ہے کہ ان حقائق پر ایمان لانا ضروری ہو گیا۔ جن کے ذریعے یہ ہدایات اور احکامات انسان کو مل سکتے ہیں اور ان ذرائع میں پہلا ذریعہ فرشتے ہیں۔ کیونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور حسی مخلوق کے درمیان قابل اعتماد واسطہ ہیں۔ یہ اپنی خداداد روحانیت اور لطافت کی وجہ سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے بھی غایت درجہ کا قرب رکھتے ہیں اور دوسری طرف مخلوق ہونے کے سبب بقیہ مخلوقات سے بھی نسبت و تعلق رکھتے ہیں اسی طرح ایک طرف تو وہ اپنی خداداد نورانیت و لطافت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے انوار و

احکامات کو براہ راست قبول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور دوسری طرف ان انوار و احکام کو مخلوق تک منتقل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ فرشتے خصوصاً جبرئیل علیہ السلام براہ راست اللہ تعالیٰ سے وحی الٰہی کو اخذ کرتے تھے۔ اور پھر اس کے حکم کے مطابق اس کے پیغمبروں کو بلا کم و کاست پہنچا دیتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ کتابوں اور نبیوں کے ساتھ فرشتوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہوا۔ کیونکہ ملائکہ، کتابوں اور نبیوں پر ایمان سب ایک دوسرے سے اتصال رکھنے والی کڑیاں ہیں۔ اور یہ سب کڑیاں مل کر ہی انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں اور انسان کے مستقبل اور آخرت کو سنوارتی ہیں اس لئے آپ قرآن مجید میں غور کریں۔ جہاں بھی تمام ایمانیات کی بات آتی ہے وہاں رسولوں سے پہلے کتاب اور اللہ تعالیٰ کی نازل شدہ ہدایات کا ذکر ہوگا کیونکہ یہ وحی اور کتاب فرشتوں ہی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام عام انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی پیغمبر ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو انسانوں تک بلا کم و کاست پہنچاتے ہیں اور ان کے عملی طریقے بتا کر ان پر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح انسانی پیغمبروں کے لئے یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی پیغمبر ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور احکامات اور بندگی کے طور طریقوں کو بلا کم و کاست انسانی پیغمبروں تک پہنچاتے ہیں۔ اور یہ تینوں کڑیاں یعنی ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل مل کر انسان کے لئے اس کی ترقی اور فلاح کی راہوں کو کھول دیتی ہیں۔

(۳) جب انسان اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی حفاظت و ترقی اور ہر چیز پر فرشتے مقرر ہیں اور یہ بھی مان لیتا ہے کہ یہ تمام کارندے اللہ تعالیٰ کے حکم اور قانون کے تحت چلتے ہیں اور اسی کے حکم سے ایک طرف تو وہ انسان کو اسباب کے استعمال اور حصول سے نہیں روکتے بلکہ جو انسان ان اسباب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو فرشتے اللہ تعالیٰ کے قانون اور سنت کے مطابق انسان کو وہ

اسباب فراہم کرتے ہیں لیکن اگر اس نے اسباب کو غلط طریقے پر حاصل کیا یا غلط استعمال کر کے ناقدری کی تو یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اس کے خلاف نقصان کی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں اور اگر وہ ان کو ٹھیک ان احکام الٰہی کے مطابق، جو پیغمبروں کے ذریعے بھیجے گئے ہیں، حاصل کرے یا استعمال کرے تو اس قدردانی کی وجہ سے فرشتے اس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق نفع وخیر کی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور نفع ونقصان کے یہ اثرات خود انسان کی ذات پر پڑتے ہیں۔ اور اس کا اثر انسان کی دنیوی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اخروی زندگی میں کامل طور پر وہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ آدمی یا تو ابدی راحتیں اور ترقیاں پاتا رہتا ہے اور یا ہمیشہ کے لئے بے چینی کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ انسان جب اس حقیقت سے باخبر ہو تو وہ اسباب کے حصول یا استعمال میں عارضی لذت وراحت کو نہیں دیکھے گا۔ بلکہ وہ ہر وقت چوکنا رہے گا کہ کوئی ایسی بات اور ایسا کام نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم کے خلاف ہو ورنہ عارضی راحت و لذت کے بعد دنیا کی زندگی میں بھی اور کامل طور پر آخرت کی زندگی میں بھی اسے بے چینی، بے اطمینانی، سخت نقصان وخسران اور تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

(۴) جب انسان ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کے عدل ورحم کے قوانین پر چلتا ہے تو اس کے آس پاس جو حفاظتی فرشتے ہیں وہ اس کی شیطانی اور جناتی اثرات سے پوری حفاظت کرتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی کو چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق فرشتے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ تو پھر جس قدر انسان بندگی کی سیدھی راہ سے ہٹتا چلا جاتا ہے اتنا ہی فرشتے بھی اپنی حفاظتی سرگرمیاں کم کر دیتے ہیں جس کے بعد وہ شخص قسم قسم کے اوہام قلبی، پریشانیوں اور مصائب کا شکار ہو جاتا ہے اور بالآخر مکمل طور پر شیطانی اور جناتی اثرات کا شکار ہو کر تباہی کے گڑھوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔

(۵) جس شخص کا اس بات پر ایمان ہو کہ فرشتے انسان (یعنی حضرت آدم علیہ السلام) کے

سامنے جھک گئے تھے تو اسے یہ یقین ہو جائے گا کہ جب یہ انسان کے آگے جھک گئے ہیں تو وہ اسباب اور قوتیں جن پر یہ فرشتے مقرر ہیں بطریق اولی انسان کے لئے مسخر ہیں تو اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہر مؤمن ان اسباب کو اور ان قوتوں کو حاصل کر کے دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور اس سے دنیا والوں کے لئے نفع کے اسباب پیدا کر سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص اسباب اور قوتوں کے سامنے نہیں جھکے گا اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون کے سوا کسی دوسری ذات یا قانون کو تسلیم کرے گا۔

لیکن آج مسلمانوں کی اکثریت کا حال دیکھیں تو وہ ان اسباب اور قوتوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان قوموں کے سامنے بھی جھکے ہوئے ہیں جنھوں نے ان قوتوں اور اسباب کو اختیار کیا ہے پس ایسی قوم مسلمان تو کیا مقام انسانیت سے بھی گر چکی ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ بلاشبہ فرشتوں پر ایمان انسان کی علمی اور عملی زندگی پر بہت گہرے اور مفید طور پر اثر انداز ہوتا ہے بشرطیکہ اس حقیقت پر صدق دل سے ایمان لایا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب

آسمانی کتابیں انسانوں کے لئے دستور حیات ہیں

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے وقتاً فوقتاً جو ہدایت نامے بھیجے ہیں۔ وہ برحق ہیں اور وہی حق و باطل کی کسوٹی ہیں اور ان ہدایت ناموں میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور بندوں کے لئے زندگی گزارنے کا دستور ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی رہنمائی پر پورا پورا اعتماد کیا جائے۔ ان پر عمل پیرا ہونے میں سراسر نفع ہے اور ان کی مخالفت میں سراسر نقصان و خسران ہے۔ جن لوگوں نے انہیں اپنا دستور بنالیا اور اس کے مطابق چلے تو وہ دنیا و آخرت دونوں لحاظ سے کامیاب و کامران ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر بہت سے صحائف اور کتابیں نازل کی ہیں جن میں چار بڑی مشہور کتابیں درج ذیل ہیں۔

(الف) تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

(ب) زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

(ج) انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

(د) قرآن مجید سید المرسلین خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوئی۔

قرآن مجید کے علاوہ بقیہ تمام کتب تحریف شدہ اور منسوخ ہیں۔

قرآن مجید سے پہلے جتنی کتابیں "تورات، زبور، انجیل" نازل ہوئیں۔ ان سب کے بارے میں یہ عقیدہ ضروری ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں۔ لیکن چونکہ ان کتابوں میں بعد کے لوگوں نے رد و بدل کر دیا ہے لہٰذا موجودہ کتابیں جو تورات، زبور، انجیل وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں یہ وہ اصل کتابیں نہیں بلکہ ان میں تحریف ہوئی ہے ان کے متعلق یہ یقین نہیں رکھنا چاہئے کہ یہ اصل کتابیں ہیں۔

آسمانی کتابوں میں سب سے آخری اور کامل و مکمل کتاب قرآن مجید ہے۔ جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور محفوظ بھی ہے۔ یعنی سابقہ کتابوں میں جتنی ایسی باتیں تھیں جن کی تبلیغ ہمیشہ اور ہر زمانے میں ضروری ہوتی ہے، وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ لہٰذا یہ تمام کتب سماویہ کے ضروری مضامین پر حاوی اور سب سے مستغنی کر دینے والی اور قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کرنے والی اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اور اسی حفاظت الٰہی کی وجہ سے آج تک قرآن مجید کا ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ محفوظ ہے۔ اس میں ایک نقطہ کی کمی بیشی نہیں ہوئی اور نہ قیامت تک ہو سکے گی۔ قرآن مجید ایک معجزہ ہے چنانچہ تمام دنیا مل کر اس کی نظیر اور مثل پیش نہ کر سکی اور نہ پیش کر سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا اثر اور اس کا لازمی نتیجہ:

اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ایمان لانے سے انسان کی زندگی پر یہ اثر پڑے گا کہ وہ اس سے محبت رکھے گا اس کو چاہے گا۔ اور اسی کی تعلیم وہدایت ورہنمائی پر اعتماد اور بھروسہ کرے گا اور اسی کو اپنی زندگی کا دستور بنائے گا اور اسی کے مطابق چلنے میں خیر و نفع کی امید رکھے گا اور اس کے خلاف سے لرزاں وترساں رہے گا۔ اسی طرح ہر شخص ان کتابوں کی رہنمائی میں دنیا اور آخرت کی بھلائی اور کامیابی حاصل کر سکے گا۔

لیکن اگر کوئی قوم یا فرد "کتاب اللہ" پر ایمان لانے کا مدعی تو ہے مگر اس کو اپنا دستور نہیں بناتا یا اس کے مطابق چلنے میں نفع کی امید نہیں رکھتا اور اس کے خلاف چلنے سے لرزاں وترساں نہیں تو ایسا شخص اور قوم دونوں کتاب اللہ پر ایمان کے باوجود ایمان سے خالی اور اپنے دعویٰ ایمان میں جھوٹے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کا مطلب اور خلاصہ

نبی وحی الٰہی کا ذریعہ ہوتا ہے:

اللہ تعالیٰ کی بندگی کا طریقہ انسان پوری طرح عقل سے حاصل نہیں کرسکتا اور نہ ہی تنہا عقل کے زور پر شاہراہ زندگی پر چلنے کے لئے رہنمائی حاصل کرسکتا ہے بلکہ یہ رہنمائی وحی الٰہی سے ملتی ہے اور وحی ہر انسان کو براہ راست نہیں ملتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ افراد کی وساطت سے ملتی ہے ان منتخب افراد کو انبیاء و رسل کہا جاتا ہے اور وحی کا یہ سلسلہ نبی کریم ﷺ پر ختم ہوگیا۔

انبیاء کی اطاعت ہی میں انسانیت کا نفع ہے:

کسی کو نبی اور رسول ماننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ وہ غیبی حقیقتوں کے بارے میں جو کچھ ہمیں بتلاتا ہے اور جو ہدایات دیتا ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور رسول کی یہ ساری باتیں گویا اللہ کی باتیں ہیں اور اس کا ہر حکم اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لیے سب حق ہی حق ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی چون و چرا شک و شبہ کی بالکل گنجائش نہیں اور یہی حضرات ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی کے بتانے والے ہیں لہٰذا ان کی اطاعت و اتباع دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت اور بندگی ہے اسی میں انسان کا نفع اور اس کی مخالفت سراسر نقصان و خسران ہے۔

پیغمبر کے ہر حکم پر ایمان لانا ضروری ہے:

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی بھی نبی یا رسول کو ماننے کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دین کے متعلق اس کی ہر بات کا انکار، اس کی نبوت کا انکار ہے۔ اس لیے ہر اس حقیقت اور حکم پر یقین کرنا اور اس پر عمل کرنا جس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ نے دی ہر

مسلمان کے لئے ضروری ہے غرض یہ کہ پیغمبر کے ہر فیصلے اور حکم کو ماننا شرط ایمان ہے اور جو شخص پیغمبر کے کسی ایک حکم سے بھی انکار کرے وہ مومن نہیں ہو سکتا البتہ جن مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ مبارک نہ پایا اور آپ کی دینی تعلیم ان کو بالواسطہ پہنچی ہو (جیسا کہ ہمارا حال ہے) ان کے لئے یہ حکم صرف انہی تعلیمات اور عقائد ہی کی حد تک ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ایسے قطعی اور یقینی طریقے سے ثابت ہیں جس میں کسی شک وشبہ اور کسی تاویل کی گنجائش نہیں اور ہر دور میں ان کی شہرت بھی اتنی عام رہی ہے کہ دین سے معمولی واقفیت رکھنے والے عوام بھی اس سے واقف رہے ہیں اور جن چیزوں کی قطعیت اور شہرت اس درجہ کی نہیں ہے (اگرچہ ان کا ثبوت ہمارے لئے قابل اطمینان ہے) تو ان کی حیثیت اور ان کا حکم یہ نہیں یعنی اگرچہ ان کا انکار کرنا بھی ایک درجہ کی گمراہی ہے لیکن کفر[1] نہیں ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام انسانیت کے اعلیٰ نمونے ہوتے ہیں:

انبیاء ورسل انسانیت کے حقیقی اور بلند ترین نمونے ہوتے ہیں وہ مکارم اخلاق کا مظہر و زندہ شخصیات ہوتے ہیں ان کا تعلق مافوق الفطرت مخلوق سے نہیں ہوتا اور نہ وہ خدا ہوتے ہیں اور نہ خدائی میں شریک ہستیاں اور نہ ہی خدا کی اولاد بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور انسان ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی انہیں اپنے بندوں تک احکام پہنچانے کے لئے مقرر فرماتا ہے۔ وہ سچے ہوتے ہیں کبھی جھوٹ نہیں بولتے وہ گناہ نہیں کرتے وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام پورا پورا پہنچا دیتے ہیں۔ ان میں کمی بیشی نہیں کرتے اور نہ ہی وہ کسی پیغام الٰہی کو چھپاتے ہیں وہ خود ساختہ انداز اور تکلف وتصنع سے بالعموم اپنی پوری زندگی میں اور بالخصوص اپنی دعوت وگفتگو میں بہت دور رہتے ہیں۔

"مَا اَسْئَلُکُم عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ"

---

[1] پیغمبر خدا ﷺ کی کسی بات سے انکار کفر کا مستلزم تب ہوتا ہے کہ جب:

(۱) یہ انکار اعتقاداً اور عملاً یا استخفافاً ہو۔ (۲) وہ بات بھی دینی امور میں سے ہو۔ (۳) یہ جان کر ہو کہ یہ بات پیغمبر ﷺ کی ہے۔ (۴) پیغمبر ﷺ نے یہ بات وحی کی بنیاد پر فرمائی ہو۔

''میں تم سے اس کا صلہ نہیں مانگتا، اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں بلکہ یہ تو مخلوقات کے لئے محض نصیحت ہے۔''

نبوت صرف عطیہ الٰہی ہے:

کوئی شخص اپنی کوشش و عبادت سے نبی نہیں بن سکتا اور نہ اس میں کسی شخص کے ارادے کو کوئی دخل ہوتا ہے بلکہ یہ صرف اور صرف عطائے الٰہی ہے لہٰذا وہ جس کو چاہے اپنے علم وحکمت کے تحت مرتبہ عطا فرمادے البتہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے آپ کے بعد نہ کوئی نبی اب تک آیا ہے اور نہ ہی قیامت تک آئے گا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد:

دنیا میں بہت سے رسول اور نبی آئے لیکن ان کی ٹھیک تعداد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ہم صرف اتنا ایمان رکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول اور نبی بھیجے ہیں یہ سب برحق ہیں بعض کے نام معلوم ہیں جیسے حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام وغیرہ۔ دنیا میں تشریف آوری اور بعثت کے لحاظ سے سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور سب سے آخری نبی خاتم الانبیاء ﷺ ہیں۔ ان پر نبوت ختم ہوگئی آپ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اور نہ کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت ہے۔ اور نہ کسی جدید شریعت اور الہامی کتاب کی ضرورت ہے اور حضور اکرم ﷺ کے بعد نظام بندگی یعنی عدل وضبط کا نظام اور خلافت کو علی منہاج الرسول ﷺ قائم رکھنا امت مسلمہ کا بنیادی فریضہ ہے۔ اب قیامت تک پیدا ہونے والوں کی نجات وفلاح خاتم الانبیاء سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کی پیروی میں ہے۔ آپ ﷺ کے بعد جو شخص پیغمبری کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔

حضور اکرم ﷺ عرب کے بہترین خاندان قریش میں سے ہیں اور پھر قریش میں سے سب سے اعلیٰ شاخ بنی ہاشم میں سے تھے۔ آپ ﷺ کے والد کا نام عبداللہ اور دادا کا

نام عبدالمطلب اور پردادا کا نام ہاشم ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے کے اثرات:

انبیاء علیہم السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے لازماً انسان کی زندگی میں تبدیلی آئے گی اور اس کی پوری زندگی نبی کریم ﷺ کی سنت اور طریقے کے مطابق ہوگی اس میں وہ شخص نفع وخیر کو دیکھے اور پائے گا اور جو آدمی نبی کریم ﷺ کی ان ہدایات اور احکامات کا اتباع نہیں کرے گا جو آپ ﷺ سے یقینی ثابت ہیں، تو یہ ایمان نہیں بلکہ ایمان کا زعم وخیال ہے۔ ایسا شخص صرف خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ حالانکہ فلاح وکامیابی کا دارومدار ایمان پر ہے نہ کہ زعم وخیال پر۔

آخرت پر ایمان اور اس کا مطلب

آخرت پر ایمان، مرنے کے بعد زندگی اور دوبارہ زمین سے اٹھائے جانے کو تسلیم کرنے اور اپنے ہر قول وفعل اور نیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونے کو ماننا ہے۔ اس عقیدہ کی ضروری تفصیل یہ ہے۔

قیامت کا قیام ناگزیر ہے:

انسان دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ دنیا کی زندگی کے ہر اختیار، حرکت اور قول وفعل اور نیت کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ جس طرح انسان دنیا میں ہمیشہ نہیں رہتا اسی طرح یہ دنیا کا نظام بھی ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ اس نظام عالم کے لئے بھی ختم ہونے کا ایک وقت مقرر ہے اور یہ مقررہ وقت پر درہم برہم ہو جائے گا اور اس وقتِ مقررہ کو قیامت کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک دوسرے عالم میں اس پوری نوع انسانی کو جو ابتداء سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت اٹھائے گا اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا بدلہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کی رو سے جو لوگ نیک نکل آئیں گے، تو وہ جنت کی دائمی خوشیاں حاصل کریں گے اور جو لوگ اس فیصلے کی رو سے مجرم ٹھہریں گے وہ جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔

موت کی حقیقت:

انسان اس معنی میں نہیں مرتا کہ وہ بالکل معدوم اور ختم ہو جائے بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جاتا ہے مثلاً دادا کی پشت سے باپ کی پشت میں، باپ کی پشت سے ماں کے پیٹ میں آ گیا اور اس میں اس کی صورت اور جسم کا ڈیل ڈول بنا اور اب دنیا کے پیٹ میں آ گیا۔ جہاں آ کر انسان اپنی سیرت بناتا

ہے۔اور پھر دنیا سے چلا جاتا ہے۔اور جب مر جاتا ہے۔تو وہاں اس دنیوی سیرت کے مطابق معاملات شروع ہوجاتے ہیں اور ہر شخص اپنی سیرت کے مطابق خوشی و راحت یا غم و تکلیف اور درد کو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق پالیتا ہے۔اور جب پوری دنیا پر اجتماعی موت طاری ہوجائے گی اور یہ نظام عالم درہم برہم ہوجائے گا تو تمام لوگ برزخی اور قبر کی زندگی اور اس کے بعد ایک اور قسم کی زندگی میں داخل ہوجائیں گے۔جسے حیات اُخروی کہا جاتا ہے۔پس آخرت سے مراد انسان کی پچھلی اور بعد میں آنے والی زندگی ہے اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے (جو انسان کے جسم اور اس کے اعضاء اور رگ و ریشہ پر طاری ہوتی ہے) حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتی ہیں۔آخرت کے اس لغوی معنی کی تصدیق خود نبی اکرم ﷺ کی حدیث میں بھی موجود ہے۔جس کا مفہوم یہ ہے۔

"قبر (برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے" (حاکم، ترمذی، ابن ماجہ)

بہرحال انسان کامل طور پر مرتا نہیں کہ اس کے جسم اور روح دونوں پر فنا آجائے بلکہ اس کے جسم پر وقتی موت طاری ہوجاتی ہے جس کا مزہ یہ انسان خود بھی چکھ لیتا ہے اور اس طرح وہ ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور ہر جگہ سے دوسری جگہ کو وسعت اور خوشی یا اس کے برعکس پریشانیوں اور دکھ درد میں ایک دوسرے سے بڑھا ہوا پاتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی ناکامی کا اصل معیار دنیا کی خوشحالی و بدحالی نہیں بلکہ درحقیقت فلاح پانے والا کامیاب انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے کی رو سے کامیاب ٹھہرے اور ناکام وہی ہے جو پچھلی اور بعد میں آنے والی زندگی اور آخری فیصلے میں ناکام رہے۔

آخرت پر ایمان لانے کا اثر و نتیجہ

(۱) آخرت کو ماننے والا ایک ذمہ دار شخص ہوتا ہے۔

(۲) وہ غریبوں، مسکینوں، بے کسوں کا خیال رکھتا ہے اور ہر ذی حق کو اپنا حق پورا پورا دیتا

اور دلواتا ہے۔ کیونکہ جس طرح ایک کاشتکار اپنی ڈھیروں گندم زمین میں بکھیر دیتا ہے اور صبح شام مشقت کرتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اس سے مستقبل میں کئی سو گنا زیادہ گندم ملے گی۔ اسی طرح جس شخص کا آخرت پر ایمان ہو تو وہ فقیر اور ہر ذی حق کو حق دے کر خوش ہوگا اور اس کو وہ غنیمت سمجھے گا کہ اس کا ثمرہ مستقبل اور آخرت میں ضرور ملے گا۔

(۳) وہ ہر اس بات کو اور اس کام کو اختیار کرے گا جو اس کی اُخروی زندگی کے لئے مفید ہو، اگرچہ اس بات اور کام کی وجہ سے اسے دنیا کی زندگی میں سخت مشقت یا دکھ درد یا نقصان اٹھانا پڑے اور وہ ہر اس بات اور کام سے پرہیز کرے گا جس سے اس کی آخرت کی زندگی پر زد پڑتی ہو اگرچہ دنیا کی زندگی میں اس بات اور کام کی وجہ سے بڑی راحت وعزت اور لذت اور بڑے مال و دولت ہاتھ آنے کا یقین ہو۔

(۴) آخرت پر ایمان رکھنے والا انتہائی مُخلص ہوتا ہے۔ وہ ریا کاری جیسے امراض میں قطعاً گرفتار نہیں ہوتا کیونکہ وہ جو کار خیر بھی کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کے لئے کرتا ہے۔ تو پھر اس میں ریا کاری کی کیا گنجائش۔ جیسا کہ ایک کاشتکار اور باغبان اپنی کاشت اور مشقت کے بارے میں یہ گمان رکھتا ہے کہ ایک ایک تخم کے بدلے میں سینکڑوں ہزاروں گنا ملتا ہے۔ تو دن رات محنت کرتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں بلکہ ایسی تمام باتوں اور نمائشوں سے بے فکر ہو کر محنت کرتا ہے اس طرح آخرت پر ایمان رکھنے والے کی نظر اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے نتائج پر ہوتی ہے۔ نہ کہ لوگوں پر کہ وہ دیکھتے ہیں یا نہیں یا لوگوں کو میرے کار خیر کا علم ہو رہا ہے یا نہیں؟ وہ ایسی تمام باتوں سے بے پرواہ ہو کر آخرت کی کھیتی میں محنت کرتا ہے۔ جو شخص یتیموں، بے کسوں اور غریبوں کا خیال نہیں رکھتا اور دنیا کی عارضی لذت، راحت اور عزت کو اپنا کر آخرت کی زندگی کو نظر انداز کر دیتا ہے وہ اپنے دنیاوی معاملات اور مفادات میں تو محتاط ہوتا ہے مگر آخرت کے معاملہ میں صرف توقعات کو کافی سمجھتا ہے یا آخرت کے معاملہ میں باطل سفارشوں اور شفاعتوں پر

سہارا کئے رکھتا ہے ایسے شخص کا آخرت پر ایمان نہیں اور وہ دعوئ ایمان کے باوجود بے ایمان اور دعوئ ایمان میں جھوٹا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو شخص آخرت کی دائمی زندگی کی عزت اور خوشی پر دنیا کی عزت وراحت کو ترجیح دیتا ہے وہ آخرت پر ایمان رکھنے والا نہیں اور ایسا شخص جو کارِ خیر بھی کرتا ہو اور اس کے پیشِ نظر دنیا کی عزت یا اور کوئی دنیوی مفاد ہو تو یہی شخص ریاکار ہے اور اس کی زندگی ایک تماشی زندگی ہے۔ جو آخرت کے مقصد سے بے پرواہ کر کے انسان کی پوری زندگی کو ایک کھیل تماشہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔

مومن اور مسلم

جو شخص اللہ تعالیٰ، اس کی صفات، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتا ہے اور ان پانچ حقائق پر محکم یقین اور اعتماد کرتا ہے اس کو مومن کہتے ہیں اور جو شخص بھی ان حقائق کو پا کر ان پر یقین کرلے گا تو وہ اپنے آپ کو صرف ایک اللہ رب العالمین کا محتاج پائے گا اور اس کے تمام امور میں خوف وامید اور تمام حوائج ومشکلات کے حل کا مرکز ومرجع اور ملاذی وملجاء ایک اللہ تعالیٰ کی ذات ہو کر رہ جائے گی۔ اس طرح وہ عاجزی وانکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات کے سامنے جھکے گا اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے احکامات وہدایات کے حوالے اور سپرد ہو جائے گا۔

انسان کی اسی کامل حوالگی اور سپردگی کا نام اسلام ہے۔ اور جو شخص اپنے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون وہدایت کے حوالے اور سپرد کردے اس کو مسلم یا مسلمان کہا جاتا ہے۔

اور یہی وہ مومن اور مسلم ہے جس پر تمام امور میں اعتماد وبھروسہ کیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس کے قول وفعل وکردار پر اعتماد کرتے ہیں اور وہ ہر ذی حق کا حق خود بھی ادا کرتا ہے اور دوسروں سے بھی دلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ گھر، معاشرہ، ملک اور پوری دنیا میں حسب استطاعت امن وسلامتی قائم رکھنے کا ذمہ دار رہتا ہے اور لوگوں کو عدل وقسط پر لانے کے لئے دوڑ دھوپ بھی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

ترجمہ: "البتہ ہم نے رسولوں کو نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ہمراہ ہم نے کتاب اور ترازو ے (عدل) بھی بھیجی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا بھی اتارا جس میں سخت جنگ کے سامان اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں۔" (الحدید)

ایمانی انقلاب

جس شخص کا اللہ تعالیٰ اور آخرت اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان ہو تو لازماً اس کی زندگی میں انقلاب آجاتا ہے۔ اس کے اندر ایک نیا عزم جاگ اٹھتا ہے اور یہی ایمان و یقین انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کی چنگاری بھڑکا دیتا ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ کردیتا ہے اس کی زندگی جو اس سے پہلے ذاتی خواہشوں اور دنیاوی مفادات پر چل رہی تھی اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کی تعلیمات کی بنیاد پر قائم ہو کر رہ جاتی ہے اور اب تک اس کا ارادہ و اختیار جس بے راہ روی کے خطوط پر استوار تھا پلٹ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا پابند ہو جاتا ہے، اب وہ اس زمین کے لوگوں کو اور دولت و خزانوں کو اور خود اپنی صلاحیتوں، طاقتوں اور اپنے جسم کے اندر کے اعضاء آنکھ، کان وغیرہ کو اپنی ملک نہیں سمجھتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا مالک سمجھتا ہے اس لئے وہ ان تمام چیزوں کو اسی کے قانون و تعلیمات کے مطابق استعمال کرتا ہے اور اس کے خلاف استعمال کرنے سے ڈرتا ہے اور ان تمام امور میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جوابدہ سمجھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کیا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی عبادت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب بھی خود آپ کے اندر فطری طور پر ہی موجود ہے اور وہ اس طرح کہ جس ذات کو آپ سراپا کمال جانتے ہیں اس کے حسن اور حسن کردار کے شیدائی ہیں۔ آپ کو یقین ہو کہ وہی

ہستی میری ہر ضرورت پوری کر سکتی ہے اس کے سوا کوئی نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتا اس کی ہر بات ٹھیک ہے۔ وہ ایسی حکیم ذات ہے کہ اس کا کوئی حکم اور ہدایت حکمت سے خالی نہیں۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل سب کو بیک وقت جانتا ہے اس کا میرے ساتھ خاص تعلق ہے۔ میرے ساتھ محبت ہے۔ میری ہر پکار کو وہ سنتا ہے، میں اس کے سامنے ہوں اور میری فلاح ونجات اور کامیابی کا راز صرف اس کی خوشنودی میں ہے۔

تو ایسی صورت میں آپ فطری طور پر اس کے سامنے انتہائی عاجزی اور محبت کے ساتھ سجدہ ریز ہو جائیں گے، اس کے قدموں میں پڑ جائیں گے۔ اس کی ہر بات کو دل و جان سے مانیں گے۔ اور صرف ادا ہی نہیں کریں گے۔ بلکہ اس کی ادائیگی میں بھرپور سرور اور راحت پائیں گے اور اس کے مشکل سے مشکل حکم کی تعمیل میں آپ لذت محسوس کریں گے کیونکہ آپ کو اس کی خیر خواہی اور حکیم ہونے پر مکمل اعتماد ہے، بس یہی چیز ہے جس کو عبادت اور بندگی کہا جاتا ہے کہ انسان انتہائی عاجزی اور محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ہر بات، ہر ہدایت اور ہر حکم پر عمل کرے اور اس کے حکم، قانون اور اس کی ہدایات کے مقابلے میں نہ تو اپنی ہوائے نفس کی تابعداری کو اختیار کرے اور نہ کسی دوسرے انسان کی اطاعت کو۔ ایسے شخص کی زندگی اور موت اور ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو کر رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ

"کہو کہ میری نماز اور میری تمام زندگی کے فرائض اور میری قربانی اور میرا مرنا اور جینا اللہ رب العالمین کے لئے ہے کوئی اس کا شریک نہیں (اور میں اس کی بندگی میں کسی کو شریک نہیں کرتا) اور مجھے اسی کا حکم ملا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں" (سورہ انعام۔ آیت ۱۶۲ تا ۱۶۳)

عقیدہ توحید کا تقاضہ اور عمل صالح:

اگر مذکورہ بالا مضمون میں غور کریں تو اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی

کہ ایمان وتوحید، انسان کے دل اور خیالات وجذبات کو ٹھیک کرکے انسان کو عمل صالح اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کی راہ پر ڈالتے ہیں۔

اسی طرح ایمان اور توحید اعتقادی امور ہیں جبکہ عمل صالح اور بندگی عملی چیزیں ہیں۔ اور چونکہ اعتقادی امور کا تعلق انسان کے دل ودماغ سے ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ چیز ہے جو نہ دیکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی سونگھی جاسکتی ہے البتہ ایمان واعتقاد کا ثمرہ انسان کے عمل کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے کردار اور طریقہ زندگی سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ مخلوق کی بندگی کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی۔ عمل وکردار سے ہٹ کر اگر صرف زبان سے توحید اور ایمان کی باریکیاں بیان کی جائیں اور اس کا اعتراف بھی کیا جائے لیکن اس کی زندگی ایمان وتوحید کے تقاضوں سے کٹی ہوئی ہو تو یہ صرف ایمان توحید کا دعوے یا فلسفہ ہے، حقیقی ایمان نہیں۔ جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس کی قدرے تفصیل اور وضاحت آگے آئے گی۔ غرض یہ کہ ایمان وتوحید ایک عقیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کے دل ودماغ پر محنت کرکے ایمان وتوحید کے نتائج اور ثمرات کی طرف ان کی رہنمائی کی اور ان کو بتایا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ نہ اپنے ہوائے نفس کی اور نہ کسی دوسری چیز کی چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا

"اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ" (نساء آیت ۳۶)

نیز حضرت نوح علیہ السلام اور تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں کو یہی فرمایا:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

"اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں" (اعراف آیت ۵۹ تا ۸۴)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

"اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا (اور انہوں نے قوم کو یہی کہا) کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو" (سورہ نحل۔ آیت:۳۶)

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ

"اور ہم نے تم سے پہلے کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں پس تم میری بندگی کرو" (انبیاء، آیت۔۲۵)

معلوم ہوا کہ لا الہ الا اللہ ایک عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں لہٰذا پوری زندگی میں صرف اسی کی بندگی کی جائے گی اور یہی بندگی کرنے کا تعلق انسان کی پوری عملی زندگی سے ہے۔ اس میں وہ کسی کو شریک نہیں کرتا نہ خارجی قوتوں کو، نہ اپنے نفس کو۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے عقیدے اور عمل اور قانون کے مقابلے میں اپنی رائے، عمل اور قانون کو ترجیح دے کر خود بھی ہوائے نفس کی اتباع کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ

"کیا تم نے اس کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے" (جاثیہ۔ آیت:۲۳)

بندگی کا سلیقہ کس سے سیکھا جائے؟

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی زندگی اور بندگی کس سے سیکھنی چاہیے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ جس طرح طب، طبیب سے، پہلوانی پہلوان سے اور دوکانداری تاجر اور جود و سخاوت کسی سخی ہی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بندگی بھی وہی سکھا سکتے ہیں جو خود اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی مرضی میں اپنی مرضی کو فنا اور ختم کرنے والے ہوں، نہ کہ وہ لوگ جو اپنے آپ ہی کو خدا بنائے بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نہ خدا ہوتے ہیں نہ خدا کے جز بلکہ خدا کی بندگی کے پیکر اور اللہ تعالیٰ کی

مرضیات کے نمونے ہوتے ہیں اور اسی سلامتی فطرت وقلب کی وجہ سے وہ اس بات کے قابل ہو جاتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی وحی اترے۔

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ایسی شخصیت ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بندگی میں سب سے بلند مقام پر فائز ہیں اور یہی آپ ﷺ کی فضیلت ہے کیونکہ جو جنس یا نوع جس مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہو وہ مقصد اس کے افراد میں سے جس میں جس قدر زیادہ ہوتا ہے وہ فرد اپنے مقصد کے لحاظ سے اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ پس اس انسان کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ ہوگی جو عبدیت اور بندگی میں سب سے بڑھ کر ہوگا۔

اس لئے سورہ "اسراء" میں نبی کریم ﷺ کو "عبدہٗ" کے لقب سے نوازا گیا ہے نیز نماز پنجگانہ میں پڑھی جانے والی التحیات میں مسلمانوں کو یہی سکھلایا گیا ہے کہ

" اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمداً عبده ورسوله "

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔" یعنی نبی کریم ﷺ ہی اللہ تعالیٰ کے کامل بندے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی پہنچانے اور سمجھانے والے رسول اور پیغمبر ہیں اور یہی بات اذان میں سمجھائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی بتانے، سمجھانے اور پہنچانے والے محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید اور اسکے رسول ﷺ کے ماننے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ قرآن مجید کو مقدس کتاب مانا جائے اور رسول ﷺ سے عقیدت رکھی جائے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کے احکام و ہدایات اور نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کی اتباع کی جائے کیونکہ رسول اس دنیا میں اس لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ اس کی اتباع میں اللہ تعالیٰ کی پوری بندگی کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو اپنایا جائے اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے ممنوع قرار دی ہیں ان سے بچا جائے اس حقیقت کی وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم السلام کے اقوال کو قرآن مجید میں یوں نقل کیا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ

"پس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور میری اطاعت کرو" (سورہ آل عمران آیت ۵۰)

نیز حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اپنی قوم سے فرمایا۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ

کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور اس کے (خوف اور اس کی) نافرمانی سے بچو اور میری اطاعت کرو (نوح۔ آیت: ۳)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

"جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی" (سورہ النساء آیت: ۸۰)

ایک اور مقام پر فرمایا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

"اور ہم نے کبھی کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی تابعداری کی جائے" (نساء۔ آیت: ۶۴)

یعنی رسول صرف اس لئے نہیں آئے کہ صرف زبانی طور پر انہیں مان لیا جائے ان پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے جائیں ان کی محبت کے گیت گائے جائیں اور انہی امور پر اکتفا کیا جائے بلکہ وہ تو اس لئے بھیجے جاتے ہیں تاکہ ان کی اتباع کی جائے ان کی باتوں پر عمل کیا جائے پس اگر صحیح طرح ان کی اتباع نہ کی گئی تو محبت اور عقیدت کے سب دعوے جھوٹے اور بے بنیاد ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی بندگی کے اہم پہلو:

اب اللہ تعالیٰ کی بندگی کے اہم پہلوؤں پر نظر ڈالیے۔

(۱) عبادات

ذکر و اذکار، نماز، روزہ، حج وغیرہ ان اعمال سے انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا تعلق اور اس کی محبت نیز حق پر صبر و استقامت پیدا ہوتی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کی بتائی ہوئی حدود میں محتاط ہو جاتا ہے اور اس کے اندر رحم، شکر، حق پر صبر و استقامت وغیرہ جیسے اچھے جذبات اور صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہی اعمال دین اسلام کی بنیاد ہیں۔ اصطلاح میں ان کو عبادات کہا جاتا ہے ان میں سے کچھ فرض ہیں کچھ واجب اور کچھ سنت ہیں اور جو اس سے زیادہ کرے وہ نوافل ہیں اور کار ثواب ہیں۔

(۲) معاملات:

اللہ کی بندگی کا دوسرا پہلو جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے یہ ہے کہ تجارت، باہمی لین دین، مال و دولت حاصل کرنے کمانے اور تقسیم کرنے کے حدود اور طریقے کیا ہیں۔ اس کے ذریعے انسان کو اپنے تمام معاملات میں رحم و عدل جیسے اہم اصول سکھائے جاتے ہیں۔

(۳) معاشرت:

اسلامی معاشرت میں انسان کو باہمی رہن سہن مثلاً ماں باپ، اولاد، رشتہ داروں، مسکینوں وغیرہ کے باہمی حقوق سکھائے جاتے ہیں جس سے دنیا میں ایک جنتی معاشرہ بن جاتا ہے، اسی کو اصطلاح میں معاشرت کہتے ہیں۔

(۴) حدود و تعزیرات:

اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی کی راہ سے ہٹ کر زندگی گزارتا ہے اور اپنے اوپر یا دوسروں پر ظلم کرتا ہے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ جو سزائیں تجویز کرتا ہے اسے اصطلاح میں حدود و تعزیرات کہا جاتا ہے۔

(۵) نظام عدالت:

اسلام باہمی لڑائیوں اور جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے عدل و قسط پر مبنی اصول بتاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی والی زندگی یعنی اسلام کو نافذ کرنے اور چلانے کے بنیادی اصول بتاتا ہے جو سراسر امانت اور عدل پر مبنی ہوتے ہیں انھیں اصطلاح میں شرعی عدالت کہا جاتا ہے۔

(۶) جہاد:

یعنی دین اسلام کے نفاذ و قیام اور پھیلانے کی راہ میں ہر رکاوٹ کے لئے جدو جہد اور قتال کرنا جس کو اصطلاح میں جہاد کہا جاتا ہے۔

یہاں عقائد کے نظام کو اس لئے بیان نہیں کیا گیا کہ یہاں مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کا بیان ہے جس کا تعلق عمل سے ہے اور عقائد کا بیان ''اسلام کے پانچ عقائد'' کے تحت گزر چکا ہے۔

امت مسلمہ کے زوال کی بنیادی وجوہات

جب بندگی کے چند اہم شعبوں کا ذکر سامنے آیا تو اب یہ سمجھیں کہ مسلمانوں پر زوال کیوں آیا؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نے اسلام اور ایمان کا نام لینے کے باوجود اسلام اور ایمان کے احکامات، مقاصد اور تقاضوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور یہی رویہ پہلی امتوں نے بھی اختیار کیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ زوال پذیر ہوئیں۔

اس کی تفصیل یوں سمجھئے کہ ہر نبی اور پیغمبر کی سعی و جدو جہد سے اس زمانے میں ماننے

والوں کی جو جماعت بنی تھی اس کی بنیاد ہمیشہ ایمان وعمل اور اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی پر ہوتی تھی۔ مگر بعد کی نسلوں میں صورت حال بدل جاتی اور اللہ تعالیٰ کا دین ان کے لئے ایک قسم کی روایت بن جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وعدے اور بشارتیں ایمان وعمل کی بنیاد پر دی جاتیں ان کو وہ قومیں محض گروہی تعلق کا نتیجہ سمجھ لیتیں اور وہ لوگ یہ گمان کر لیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ان کے گروہ کے ساتھ کوئی خاص رشتہ ہے جو دوسرے لوگوں سے نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص اس مخصوص گروہ اور جماعت سے تعلق رکھے گا خواہ عقیدے اور عمل کے اعتبار سے وہ کیسا ہی ہو اس کی نجات بہر حال ہو کر رہے گی۔ [1]

یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے سابقہ امتوں پر زوال آیا۔ یہ لوگ اپنے نبی اور اپنی کتاب سے بے تعلقی کا اعلان نہیں کرتے تھے بلکہ شریعت اور دین ان کی نسلی روایات میں اس طرح شامل ہو جاتا کہ وہ اس سے کسی طرح علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

چنانچہ ایسے لوگوں کا اپنے دین، اپنے نبی اور اپنی کتاب سے یہ تعلق صرف رسمی رہ جاتا ہے اور پھر اپنی دنیاوی سرگرمیاں بھی دین کے نام پر جاری کر دیتے۔ اس طرح کے لوگ بے دین و بے ایمان ہو کر بھی اپنے آپ کو دیندار کہلانا چاہتے ہیں۔ اور آخرت کی زندگی سے بے فکر ہو کر زندگی گزارتے ہیں کیونکہ وہ آخرت کے لئے ایمان وعمل کی بجائے ایسے عقیدے گھڑ لیتے ہیں جن کے مطابق انھیں اپنی نجات بالکل یقینی نظر آتی ہے۔ وہ دین کے کام تو کیا جو چند ایک بے جان اعمال بھی کرتے ہیں تو ان میں بھی ان کی دنیا پرستی کی روح

---

[1] جیسا کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر کسی نے گروہی بنیاد پر اپنے آپ کو نجات یافتہ قرار دیا تھا اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ آخرت کے بدلے دنیا کو لے لیتے تھے۔ پھر بھی کہتے تھے "سَيُغْفَرُ لَنَا" "ہم یقیناً بخش دیے جائیں گے۔" (اعراف۔ آیت: ۱۶۹) اور کہتے تھے "نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ وَأَحِبَّاؤُهُ" "(گویا) ہم اللہ کے بیٹے اور لاڈلے ہیں۔ (امت مرحومہ ہیں ہماری نجات یقینی ہے) (مائدہ آیت ۱۸) اور کہتے تھے "لن تمسنا النار الا ایاما معدودات "۔ (گناہوں کی بدولت) ہرگز ہمیں جہنم کی آگ نہیں چھو سکتی مگر صرف چند روز (پھر جنت میں مزے کریں گے) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کے خیالات کے متعلق فرمایا "تلک امانیهم "۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں" (البقرہ آیت ۱۱۱)

دوڑتی رہتی ہے۔ وہ خودساختہ سیاست چلاتے ہیں اور اسی سیاست کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ آدمی اگر دنیا کی زندگی اپنائے اور آخرت سے بے پرواہ ہو جائے تو یہ صرف ایک گمراہی ہے لیکن اگر وہ اپنے دنیاوی کاروبار کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نام پر کرنے لگے تو یہ گمراہی پر گمراہی اور چوری پر سینہ زوری ہے۔ جس کی وجہ سے یہ قوم دوسروں کے مقابلے میں زیادہ گر جاتی ہے اور دنیا و آخرت میں ایسی قوم بحیثیت قوم تباہ و برباد، محکوم اور دوسروں کی غلام بن جاتی ہے۔

رسمی عقائد و اعمال سے انسان آرزوؤں کا غلام بن جاتا ہے:

اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسی قوم کی اکثریت کی نظر سے حقائق، مقاصد حق، نتائج حق اور سعی و عمل کا جوہر ہٹ جاتا ہے اور وہ لوگ صرف جھوٹی آرزوؤں اور بے بنیاد امیدوں میں وقت گزارتے ہیں کہ ہم نے زبانی طور پر فلاں گروہ سے اپنے آپ کو وابستہ کرلیا ہے اور ایمانیات وغیرہ بھی یاد کر لئے ہیں ہماری کامیابی یقینی ہے۔

درحقیقت ایسی صورت میں ان کا ایمان اللہ تعالیٰ اور حقائق پر نہیں ہوتا بلکہ ان کا ایمان اور ان کے عقائد صرف قومی اور رسمی ہوتے ہیں اگر وہ دین کے چند اعمال و فرائض ادا بھی کرتے ہیں تو صرف رسمی طور پر ادا کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے دلوں سے عبادت کی روح اٹھ جاتی ہے اور وہ صرف اسی خبط اور حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میرا تعلق یا نسب تو بزرگوں سے ہے یا میری جماعت اور دین افضل ہے وغیرہ وغیرہ باتوں کو ایسے طلسماتی طور پر الہ دین کا چراغ بناتے ہیں گویا انہی چند باتوں پر عمل سے ہی دنیا و آخرت کی کامیابیاں موقوف ہیں اور یہی شیطانی دھوکہ ہے۔ جیسے کہ شیطان ملعون نے خود اللہ تعالیٰ سے کہا تھا" وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ "اور میں ضرور انہیں (جھوٹی) آرزوؤں کے جال میں پھنسادوں گا (اور پھر وہ جھوٹی آرزوؤں میں اپنی زندگی بسر کیا کریں گے) (نساء آیت:۱۱۹)

اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ شیطان کا طریقہ واردات بتاتے ہیں کہ:

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا

”شیطان ان کو (کامیابی، سعادت وغیرہ کا) وعدہ دیتا ہے اور ان کو آرزوؤں میں پھنساتا ہے اور شیطان کے وعدے سراپا فریب ہیں۔“ (النساء، آیت:۱۲۰)

پھر اللہ تعالیٰ نے نجات اور فلاح کی حقیقی راہ بتلائی جو آرزوؤں اور رواجی ایمانیات کی راہ نہیں بلکہ سچے ایمان وعمل کی راہ ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات و ہدایات کے حوالے ہو جائے اور اپنی مرضیات کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں گم کر دے۔

چونکہ ان جھوٹی آرزوؤں اور جھوٹی امیدوں میں اکثر آسمانی کتابوں والے پڑ جاتے ہیں اور ایمان اور عدل ورحم کی زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور پھر بھی اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو یوں واضح فرمایا کہ:

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۝ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا

ترجمہ: ”یعنی (نجات وفلاح کا دارومدار) نہ تو تمہاری امیدوں اور آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر (بلکہ نجات کا دارومدار ایمان وعمل اور کامل سپردگی پر موقوف ہے لہٰذا) جو برائی کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا اور اپنے لئے اللہ تعالیٰ (اور اس کے قانون) کے سوا (دوسرا) کارساز اور مددگار نہ پائے گا اور جو شخص نیک کام کرے گا۔ خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں ہوگی اور یہ مومن وہی لوگ ہیں جو کامل طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون وہدایات کے حوالے اور سپرد ہو جائیں اور دین کے اعتبار سے اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ (اور اس کے قانون وہدایات) کے حوالے کر دے۔ در آنحالیکہ وہ محسن (خوب خالص نیکوکار) بھی ہو اور ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت کی پیروی کرے جو (اللہ تعالیٰ اور اس کی بندگی سے ہٹے ہوئے تمام راستوں سے منہ موڑ کر صرف

اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف) بالکل یکسو تھے اور (اس وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا دوست بنایا (اور جس کی فطرت سلیم ہو اور مومن ہو وہ کیوں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد نہیں کرے گا۔ کیونکہ جب وہ آسمان و زمین اور اس میں جو کچھ بھی ہے پر نظر ڈالے گا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ) اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے (تو صرف وہی بندگی کے لائق و حقدار ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہو جاتا ہے)

(سورۃ النساء آیت نمبر ۱۲۳ تا ۱۲۶)

خلاصہ یہ ہوا کہ جب حامل کتاب قوم کے ذہنوں سے حقائق اور مقاصد دین گم ہو جاتے ہیں اور ان کا دین ایک قومی روایت بن جاتا ہے تو پھر ان کے ایمان اور عقائد رسمی ہو جاتے ہیں۔ ان کی تقریریں رسمی ہو کر لفاظی اور محض شاعری بن جاتی ہیں جو صرف کانوں کو اچھی لگتی ہیں اور ان کے دینی اعمال میں عبادات کی روح ختم ہو کر وہ بھی ایک قسم کی قومی رسوم بن جاتی ہیں اور ان کی زندگی سے رحم و عدل، امانت داری، سعی و کوشش اور عمل وغیرہ نکل جاتے ہیں۔ وہ کتاب پڑھتے پڑھاتے ہیں، سیکھتے سکھاتے ہیں اور اختلافی مسائل کی بنیاد پر امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اپنے مسلک کی بنیاد پر امیدیں اور آرزوئیں رکھتے ہیں کہ جنت اور کامیابی و فلاح تو صرف ان ہی کے لئے ہے۔ کسی دوسرے کا اس میں کیا حصہ! تو ظاہر ہے کہ ایسی قوم بے عمل، بے کردار اور اس کی سیرت و اقدار بلکہ ناسور بن کر پورا معاشرہ تباہ و برباد کر دیتی ہے جیسے کہ اس کا ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے۔

حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے کسی چیز کی (پیش گوئی کا) ذکر کیا۔ پھر فرمایا کہ یہی وقت ہے جس میں علم ختم ہو جائے گا۔ حضرت زیاد کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ علم کیسے جاتا رہے گا۔ جبکہ ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پڑھوائیں گے اور یہی سلسلہ قیامت تک یوں جاری رہے گا۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" ثکلتک امک زیاد انی کنت لا راک من افقه رجل بالمدینه اولیس

هذه الیهود والنصارىٰ یقرئون التوراة والانجیل لا یعملون بشیء مما فیهما .“

”اے زیاد تجھ کو تیری ماں گم کرے۔ میں تم کو مدینہ کا سمجھدار آدمی خیال کرتا تھا (کیا تم نہیں دیکھتے کہ) یہ یہود اور عیسائی تورات اور انجیل پڑھتے ہیں لیکن ان کی کتابوں میں جو کچھ ہے۔ اس میں کسی چیز پر عمل نہیں کرتے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰۃ کتاب العلم)

حدیث میں غور کیجئے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہود و نصاریٰ دینی رسوم بھی ادا نہیں کرتے تھے یا دین کو مانتے نہیں تھے۔ بلکہ ان کا حال یہی تھا کہ وہ حقائق، مقاصدِ دین، عملی زندگی، ایمانی سیرت اور کردار کو چھوڑ چکے تھے۔

قوموں کو بے عمل بنانے میں زیادہ دخل رہبرانِ دین کا ہوتا ہے:

آسمانی کتب کے حامل لوگوں کی بربادی اور ان کی بے عملی اور بدعملی میں زیادہ دخل ان کے علماء و مشائخ اور مبلغین کا ہوتا تھا اور اس کی چند وجوہ ہیں۔ یہ لوگ صبح و شام دین ہی کے مشغلوں میں مصروف نظر آتے تھے اور دین کے نام پر ہی ان کی قیادت قائم ہوتی تھی اور دین ہی کے نام پر انہیں بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں مگر ان کی قیادت و مقبولیت کا راز یہ ہوتا تھا کہ وہ عوام کو وہ دین پیش کرتے تھے۔ جو عوام کو پسند ہوتا، نہ کہ وہ دین جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو۔ ان کا بولنا اور چلنا بظاہر دین کے لئے تھا مگر حقیقتاً وہ ایک قسم کی دنیاداری تھی جو دین کے نام پر جاری تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی حالت کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ

”اور تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ گناہ، ظلم، زیادتی اور مال حرام کھانے میں بڑے تیز رفتار ہیں (افسوس کہ دعویٰ ایمان کے بعد) کیا ہی برے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ ان کے علماء و مشائخ ان کو کیوں نہیں روکتے گناہ کی بات کہنے سے اور مال حرام

کھانے سے۔ (افسوس ان پر) کیسے برے کام ہیں۔ جو کرتے ہیں۔"

(مائدہ۔ آیات: ۶۲ تا ۶۳)

اس آیت کریمہ میں عوام کے عمل کو " یعملون " کی صفت سے اور مشائخ وعلماء کے عمل کو " یصنعون " کی صفت سے تعبیر کیا گیا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ دین کے کام میں خوب مشغول تھے۔ انہوں نے دین میں مشغولی کو گویا دنیا کا ایک کاروبار بنایا تھا۔ نہ لوگوں کی اصلاح کی فکر تھی، نہ منکرات پر روک ٹوک۔ بلکہ چند اختلافی مسائل پر لوگوں کو اپنے ساتھ جمع کر کے زوردار بیانات کرتے تھے اور دین کے چند اعمال کو نمائشی طور پر ادا کر کے اپنے آپ کو بڑا دین دار سمجھتے تھے۔

یہ لوگ اپنے عوام کو برے کاموں سے کبھی کبھی روکتے بھی تھے مگر انہوں نے گویا اپنی عوام کے ساتھ ایک خاموش مفاہمت کر لی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے باہمی فروعی مسائل میں خوب لڑتے تھے۔ مگر دین کے بنیادی اصولوں پر انہوں نے لڑنا ترک کر دیا تھا۔ انہوں نے تقریروں اور بیانوں کو چھوڑا نہیں تھا بلکہ وہ برابر لمبی چوڑی تقریریں و بیانات کرتے تھے اور ان کی خوبصورت خوش الحان تقریریں محرابوں اور گنبدوں میں گونجتی تھیں مگر وہ اس معاملہ میں سنجیدہ نہ تھے کہ جب کسی برائی کو کرتا دیکھیں تو اسے روکنے کے لئے میدان عمل میں کود پڑیں۔ منکرات کو بدلنے کی کوشش کریں بلکہ وہ سرسری طور پر منع کرتے اور اس منع کرنے پر مطمئن ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

" بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر داؤد علیہ السلام کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے اور ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ کیا ہی برا کام جو وہ کرتے تھے (کہ ایک دوسرے کو برائی سے نہیں روکتے تھے)" (مائدہ۔ آیات: ۷۸، ۷۹)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلا تنزل (اور دینی نقصان) اس طرح شروع ہوا کہ ایک شخص کسی دوسرے سے ملتا اور انہیں کسی ناجائز کام یا بات کو کرتے ہوئے دیکھتا۔ تو وہ اس کو منع کرتا (اور اس سے کہتا) کہ دیکھو اللہ تعالیٰ سے ڈرو ایسا نہ کرو۔ لیکن اس کے نہ ماننے کے باوجود پھر بھی وہ اس سے اپنے تعلقات، اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے میں ویسا ہی برتاؤ کرتا جیسا کہ اس سے پہلے تھا۔ جب عام طور پر ایسا ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے بعضوں کے دلوں کو بعض کے ساتھ (خلط ملط کر کے) ٹکرا دیا (یعنی اس رویہ سے ان اچھوں کے دلوں نے ان کے برے اثرات کو قبول کیا اور بالآخر ان اچھوں کے دل بھی بُروں کی طرح ہو گئے اور ان کے دلوں میں بھی منکرات کی اہمیت نہ رہی) پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد کی تائید میں انہی آیتوں کا حوالہ دے کر (لعن الذین کفروا سے فاسقون تک آیتیں پڑھیں) پھر اس کے بعد فرمایا:

"کلا اللہ لتامرن با لمعروف ولتنهون عن المنکر ولتاخذن علیٰ ید الظالم ولتاطرن علیٰ الحق اطرا و لتقصرنه علیٰ الحق قصرا او لیضربن اللہ بقلوب بعضکم علیٰ بعض ولیلعنکم کما لعنهم"

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کی قسم یا تو تم نیکی کا حکم کرو گے اور برائی سے منع کرو گے اور ظالم کا ہاتھ (ظلم سے) پکڑو گے اور اس کو حق و انصاف کی طرف کھینچ کر لوٹا دو گے اور اسے عدل کا زبردستی پابند کرو گے ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو آپس میں ٹکرا دے گا اور تم پر ایسی ہی لعنت (اور اپنی رحمت سے محروم) کرے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر لعنت کی (اور اپنے رحم سے محروم کر دیا ہے)" (ترمذی اور ابوداؤد)

قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے بعد آج کل کی بائبل (جسے اہل کتاب آسمانی کتابوں، تورات، زبور اور انجیل وغیرہ کے مجموعے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں) حالانکہ وہ تحریف و تبدیل سے پُر ہے۔ پھر بھی اس میں بنی اسرائیل کے متعلق جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں کہ بنی اسرائیل کو اپنے انبیاء کی طرف سے ان ہی بدعملیوں اور بے روح اعمال پر سخت ٹوکا گیا۔ یہاں ہم اس بارے میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چند ایسے جملے نقل کرتے ہیں جن کو دیکھ کر مسلمانوں کو ان سے عبرت حاصل کرنی

چاہیے کہ یہ وہی حالت ہے جو آج کل مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی بنی اسرائیل پر ملامت اور لعنت:

چنانچہ اس کے متعلق حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی مناجات اور دعاؤں میں جو کچھ کہا ان میں سے کچھ کو یہاں نقل کرتا ہوں۔

(۱) اے خداوند بچالے کیونکہ کوئی دیندار نہ رہا اور دین دار لوگ بنی آدم میں سے مٹ گئے وہ اپنے ہمسایہ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ خوشامدلبوں سے دورنگی باتیں کرتے ہیں۔ خداوند سب خوشامدلبوں اور بڑے بول بولنے والی زبان کو کاٹ ڈالے گا۔ (زبور باب ۱۲ آیت نمبر ۱ تا ۳)

(۲) مجھے اُن شریروں اور بدکرداروں کے ساتھ گھسیٹ کر نہ لے جا جو اپنے ہمسایہ سے صلح کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر ان کے دلوں میں بدی ہے۔ ان کے افعال واعمال کی برائی کے موافق ان کو بدلہ دے۔ (زبور باب ۲۸، آیت نمبر ۴)

(۳) لیکن خدا شریر سے کہتا ہے تجھے میرے آئین بیان کرنے سے کیا واسطہ اور تو میرے عہد کو زبان پر کیوں لاتا ہے۔ جبکہ تجھے تربیت سے عداوت ہے اور میری باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتا ہے تو چور[1] کو دیکھ کر اس سے مل گیا اور زانیوں[2] کا شریک رہا ہے۔ تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے اور تیری زبان فریب گھڑتی[3] ہے۔ تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے۔ اب اے خدا کو بھولنے والو! اسے سوچ لو ایسا نہ ہو کہ میں تم کو پھاڑ ڈالوں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔ (زبور باب ۵۰، آیت نمبر ۱۶ تا ۲۲)

(۴) اے خدا میرے محمود! خاموش نہ رہ کیونکہ شریروں دغابازوں نے میرے خلاف منہ

---

[1] جس طرح آج کل کی سیاسی پارٹیاں اور حکمران طبقہ سب ڈاکوؤں اور چوروں کی ٹولیاں ہیں اور بعض دین دار طبقہ بھی ان سے مل کر لوگوں کو لوٹ رہے ہیں اور ان کا خون چوس رہے ہیں۔

[2] آج کل کے اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اس کے کارکن اور حکومت سب فحاشی کو فروغ دے کر صرف زانیوں کے شریک ہی نہیں بلکہ لوگوں کو زنا پر ابھارتے ہیں پھر بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور لوگ بھی ان کو مسلمان کہتے ہیں۔ (والی اللہ المشتکی)

[3] جیسے کہ آج کل کے پروپیگنڈے ہیں۔ جن میں نام نہاد پرہیزگار بلکہ نام نہاد علماء و مشائخ بھی ملوث رہتے ہیں۔

کھولا ہے۔انہوں نے جھوٹی زبان سے مجھ سے باتیں کی ہیں۔انہوں نے عداوت کی باتوں سے مجھے گھیرلیا ہے۔(زبور باب ۱۰۹، آیت نمبر ۱ تا ۳)

چند آیات کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے بددعا کی ہے۔جس کے چند جملے یہ ہیں۔

''اس کا منصب دوسرا لے، اس کے بچے یتیم ہو جائیں اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے۔اس کے بچے آوارہ ہو کر بھیک مانگیں۔ان کو اپنے ویران مقاموں سے دور جا کر ٹکڑے مانگنا پڑیں۔قرض خواہ اس کا سب کچھ چھین لیں اور پردیسی اس کی کمائی لوٹ لیں۔کوئی نہ ہو جو اس پر شفقت کرے۔اس لئے کہ اس نے رحم کرنا یاد نہ رکھا۔غریب اور محتاج اور شکستہ دل کو ستایا تا کہ ان کو مار ڈالے، بلکہ لعنت کرنا اسے پسند تھا سو وہی اس پر آ پڑی۔اس نے لعنت اپنی پوشاک کی طرح پہنی اور وہ پانی کی طرح اس کے باطن میں اور تیل کی طرح اس کی ہڈیوں میں سما گئی'' الخ (دیکھئے پورا باب نمبر ۱۰۹)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل پر ملامت اور لعنت:

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بنی اسرائیل کو بہت ہی ملامت کیا اور ان پر لعنت کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ ان کے متعلق فرمایا وہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

(۱) اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو[۱]۔کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھاوے کے لئے نماز کو طول دیتے ہو۔تمہیں زیادہ سزا ہوگی۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ ایک مرید کرنے کے لئے تم تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

[۱] آج کل کے حالات پر نظر ڈالو کہ اللہ تعالیٰ کے قانون اور نظام اسلام کے لئے کون لوگ ہیں جو رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

(انجیل متی باب ۲۳، آیت نمبر ۱۳ تا ۱۵)

آج کل کے اکثر مسلمان علماء و مشائخ اور بعض مدارس کا اہتمام کرنے والوں کی حالت پر نظر ڈالی جائے کہ مرید اور شاگرد بنانے کے بعد ان کی تربیت ایسے کرتے ہیں کہ نہ صحیح علم حاصل ہوتا ہے اور نہ صحیح تربیت ہوتی ہے۔ بلکہ نہ رحم ہوتا ہے نہ امانت داری اور سچائی ہوتی ہے۔ صرف چند نمائشی چیزوں پر اختلافی مسائل کی ادائیگی یا ان کے ترک کرنے پر زور دے کر دوسروں کی مخالفت پر ابھارتے ہیں۔

(۲) اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پودینہ، سونف اور زیرہ پر تو یکی (عشر) دیتے ہو، پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں[1] یعنی انصاف اور رحم اور ایمان[2] کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے[3]

اے اندھی راہ بتلانے والو جو مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہوں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو ممتاز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔ (انجیل متی باب ۲۳ آیت نمبر ۲۳ تا ۲۸)

آج مسلمان کی ظاہری پرہیزگاری، مستحبات اور نوافل پر زور کو دیکھیں کہ اگر یہ راستے میں ایک کھجور پالیتا ہے تو اس کو حرام سمجھ کر لوگوں میں آوازیں لگاتا ہے کہ یہ کس کی

---

[1] یہی وہ بعض مقاصد دین اسلام ہیں جن کو مسلمانوں نے بھی اختلافی مسائل اور صرف چند بے جان اعمال کے انبار میں گم کر دیا ہے۔

[2] بنی اسرائیل نے تورات پر ایمان کو نہیں چھوڑا تھا بلکہ ایمان کے جو تقاضے تھے انہیں فراموش کر دیا۔ اور ایمانی صفات سے خالی ہو کر ایمان کے زبانی اور رواجی دعویدار تھے ورنہ دیکھنے وہ لمبی لمبی نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ گندم وغیرہ سے تو کیا بلکہ سونف، زیرہ اور پودینہ سے بھی عشر نکالتے تھے۔ لیکن ان کے اندر عدل و انصاف، ایمان اور رحم کی روح نہیں دوڑ رہی تھی۔

[3] یعنی جس طرح اعمال شریعت لازم ہیں اسی طرح مقاصد شریعت کو ملحوظ رکھنا بھی لازم ہے۔

ہے۔ لیکن یہی آدمی مختلف طریقوں اور حیلوں سے زکوٰۃ وغیرہ وصول کر کے یتیموں اور مسکینوں کا حق مارتا ہے۔ استعمال شدہ پانی کے چھینٹوں سے تو بچتا ہے لیکن غیبت، جھوٹ اور اپنے حریف کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈوں کے بدبودار تالاب میں نہا کر اپنے آپ کو صاف سمجھتا ہے آخر یہ نمائشی دین نہیں تو پھر کیا ہے؟

سابقہ قوموں کا حال:

غرض یہ کہ بنی اسرائیل وغیرہ آسمانی کتاب والوں میں ہمیشہ یہی غلطی رہی کہ نمائشی اعمال پر (یعنی جن اعمال سے انسان کی دین داری کا اظہار ہوتا ہے) تو وہ اہتمام کے ساتھ عمل کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا آئین بھی بیان کرتے تھے۔ مگر جب صاحب معاملہ سے انصاف کا سوال ہوتا یا کمزور پر رحم کا تقاضا ہوتا یا اور کوئی ایسا حکم جس سے نفس کو کچل کر اللہ تعالیٰ کے حکم اور بندگی کی ضرورت ہوتی تو وہ پھسل جاتے تھے نہ خود اللہ تعالیٰ کی پوری بندگی کو اختیار کرتے تھے اور نہ دوسروں کو اس پر چلاتے تھے۔ اس وقت وہ لوگ خدا کی بندگی میں شرک کرنے لگ جاتے تھے۔

مثلاً دیکھئے مدینہ منورہ کے اطراف میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنو قینقاع۔ یہ سب تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو مانتے تھے مگر ان کے جاہلی تعصبات نے ان کو الگ الگ جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔

بنو نضیر اور بنو قریظہ مشرک قبیلہ "اوس" کے ساتھ سیاسی گٹھ جوڑ رکھتے تھے اور بنو قینقاع مشرک قبیلہ "خزرج" کے ساتھ۔ اس طرح دو گروہ بن کر باہمی لڑائیوں میں یہ یہودی قبائل مشرک قبائل کے ساتھ مل کر ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنالیتے تھے۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور ان کو گھروں سے بے گھر کرتے تھے۔ جب جنگ ختم ہو جاتی تو وہ تورات کا حوالہ دے کر اپنے ہم مذہبوں اور ہم مسلکوں سے چندوں کی اپیلیں کرتے تھے تاکہ اپنے گرفتار بھائیوں کا فدیہ دے کر مشرک قبائل کے ہاتھ سے چھڑائیں۔

وہ انسانوں کے جان و مال کے احترام کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم کو توڑ دیتے تھے مگر نمائشی ہمدردی اور دین کے بعض حصوں پر، جس میں ان کے نفسوں کو

نہیں نکالا جاسکتا تھا عمل کرتے تھے اور جہاں نفس پر بوجھ پڑتا وہاں اللہ تعالیٰ کے رحم، عدل ،انصاف اور اللہ تعالیٰ کے قانون کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ ایک شخص کو ناحق قتل کرایا جاتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حکم تو یہ ہوتا ہے کہ "ظالم کے ہاتھ کو روکو"۔ مگر اس حکم کو نظر انداز کیا جاتا ہے مگر جب اس کو قتل کیا جاتا ہے تو پھر اس کے بعد اس پر شرعی طریقے سے نماز پڑھی جاتی ہے۔

پس ایسی قوم حقیقی دین داری اور سچی بندگی کے لئے تیار نہیں بلکہ صرف چند نمائشی امور کی دھوم مچا کر لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتی ہے کہ گویا ہم لوگ خدا کے دین پر پوری طرح قائم ہیں۔ ایسی قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ

ترجمہ: "کیا تم کتاب الٰہی کے بعض حصے کو مانتے ہو اور بعض حصے کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں اس کی سزا اس کے سوا کیا ہوگی کہ ان کو دنیا کی زندگی میں (ذلت اور رسوائی) ہو۔ اور روز قیامت ان کو سخت ترین عذاب میں ڈال دیا جائے۔"
(بقرہ۔ آیت:۸۵)

بہر حال آسمانی کتب کی حامل قوموں کے علماء و مشائخ اور مبلغین کے اندر جب حقیقی طور پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی روح ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے بیانوں اور وعظوں سے لوگوں سے داد حاصل کرنے کے خواہاں ہو جاتے ہیں۔ اور عوام کو سستی نجات کے ایسے مقدس نسخے بتاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ بغیر کسی محنت اور بغیر صحیح ایمان و عمل، بغیر رحم و عدل اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدو جہد اور جہاد کرنے کے، وہ اپنے آپ کو نجات یافتہ اور جنتی لوگ سمجھنے لگتے ہیں۔ تو ایسے ہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے سخت ملامت فرمائی ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد:

خلاصہ یہ کہ جب کسی قوم کی ایسی حالت ہو جاتی تھی کہ وہ ایمان و عمل اور بندگی کی سیدھی راہ کو گم کر کے صرف چند بے جان اعمال اور نمائشی دین کو اختیار کر کے دنیا والوں کو

اللہ تعالیٰ کی بندگی صحیح معنوں میں پہنچانے کو چھوڑ دیتے تھے تو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ یوں نہیں چھوڑ دیتا تھا بلکہ اسی وقت وہ دنیا میں اپنا نبی بھیج دیتا تھا تاکہ وہ لوگوں کو پھر سے دین حق کی راہ اور ایمان و عمل اور اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی پر ڈال دیں اور وہ نبی ایسی جماعت کو تیار کرتے تھے جو لوگوں کے سامنے اپنے قول و عمل کے ساتھ گواہی کے لئے کھڑی ہو جاتی تھی۔

اسی طرح بالآخر اللہ تعالیٰ کے آخری نبی پر آخری غیر متبدل کامل و مکمل کتاب نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید جس پر اللہ تعالیٰ کی بندگی منحصر ہے وہ نہ تو تبدیل ہو سکتی ہے، اور نہ اس میں تحریف ہو سکتی ہے۔ البتہ اس کے حامل لوگ دین کے بارے میں وہ رویہ اختیار کرنے لگتے ہیں۔ جو پہلے آسمانی مذاہب والوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

" لیأتین علی امتی کما اتیٰ علیٰ بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل "

ترجمہ: "میری امت پر ضرور ایسا زمانہ آئے گا۔ جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا جیسا کہ ایک جوتے کے ساتھ دوسرا جوتا برابر ہوتا ہے"

الحدیث (احمد، ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ کتاب العلم)

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کتاب اور سنت رسول ﷺ کو پہنچانے کے لئے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کے اندر ایک ایسی جماعت موجود رہتی ہے کہ جب دین اسلام میں افراط و تفریط اختیار کیا جاتا ہے تو انہیں ٹوکنے اور سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کھڑا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

ترجمہ: "یہ یاد دہانی (کتاب) ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" (الحجر۔ آیت: ۹)

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

" ان اللہ عز و جل یبعث لھذہ الامہ علیٰ رأس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا "

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے بعد ایک آدمی بھیجتا رہے گا۔ جو اس امت کے لئے اس کا دین تازہ کرتا رہے گا۔“ (ابوداؤد، مشکوۃ کتاب العلم)

مکمل بندگی کے لئے تیار نہ ہونے والا اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شرک کا مرتکب ہوتا ہے:

اب ہم اللہ تعالیٰ کی بندگی میں شرک کی چند صورتیں بیان کرتے ہیں تاکہ خالص بندگی واضح ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کی بندگی میں شرک کے دو اہم پہلو یا دو اہم صورتیں

اللہ تعالیٰ کی بندگی میں شرک کے دو اہم پہلو یا دو اہم صورتیں یہ ہیں:۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے حکم اور قانون کے بجائے اللہ تعالیٰ کے خلاف قانون پر اعتماد ہو اور اللہ تعالیٰ کے مقابل دوسروں کے قانون اور حکم کو ترجیح دے کر اختیار کیا جائے۔ خواہ خود وہ قانون بنانے والا اس کا اپنا نفس ہو یا کوئی دوسرا انسان۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا حکم تو رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر ادا کیا جائے مگر اس کو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نہیں بلکہ اس کے ساتھ دوسروں کو دکھاوے کا مقصد بھی شامل ہو، تو اس کو ریاء کاری کہتے ہیں اور اس کو شرک خفی یعنی پوشیدہ شرک بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہری بندگی تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہو رہی ہے لیکن بندگی کی روح میں دوسروں کو حصہ دار بنا دیا جا رہا ہے اور آسمانی کتاب کے حامل لوگوں کی اکثریت اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے اختیارات میں شرک کو گوارہ نہیں کرتی بلکہ الفاظ کی حد تک وہ پکے موحد ہوتے ہیں لیکن وہ اسی عملی شرک یعنی عبادت کے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور اس کی پشت پر بھی اعتقادی شرک کی قوت ہوتی ہے اگر چہ وہ زبان سے لاکھ دعویٰ کریں اور توحید کی لمبی لمبی تقریریں کریں، پھر بھی ان کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں

ہوتی۔ کیونکہ صحیح اعتقاد سے صحیح نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اگر توحید اور ایمان کی تقریریں ہیں اور کردار نہیں، تو معلوم ہوا کہ اندر ایمان وتوحید کی روشنی موجود نہیں ہے اور ان کے یہ جذبات نہیں بلکہ ان کی حیثیت صرف ٹیپ ریکارڈ کی ہے جو بولتا تو ہے لیکن اس کے اندر کوئی ایمان نہیں ہوتا بلکہ صرف اس کی حیثیت ایک ناقل کی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مومن غلطی نہیں کرتا بلکہ مومن وہی ہے جس پر جب جذبات غالب آجاتے ہیں اور اس سے غلطی ہوجاتی ہے تو جذبات ٹھنڈا ہونے کے فوراً بعد وہ سخت نادم ہوجاتا ہے اور پلٹ کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے لگتا ہے اور غلطی کے لئے دلائل نہیں ڈھونڈتا بلکہ کھل کر اعتراف کرتا ہے کسی سے زیادتی کرتا ہے، تو غلطی کا اعتراف کرکے اس سے معافی مانگتا ہے البتہ وہ شخص جو غلطی کے لئے دلائل ڈھونڈھتا ہے غلطی کا اعتراف نہیں کرتا اور غلطیوں پر نادم اور شرمندہ نہیں ہوتا تو یہی وہ شخص ہے جو اپنے نفس کے کرتوت سے خوش اور اپنے نفس کی بندگی کرتا رہتا ہے۔

نیز یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس مختصر رسالہ میں نہ تو مجھے مستقل شرک کی اقسام بیان کرنی ہیں اور نہ نفس کی بندگی کی اقسام۔ اس کا پورا بیان بندہ کی کتاب ''عقیدہ اور عقیدت'' اور اس سے بھی زیادہ تفصیل بندہ کی کتاب ''توحید صحابہ'' میں موجود ہے۔ وہاں ملاحظہ کیجئے۔

اور اس مضمون کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کو خبردار کیا جائے کہ کامیابی وفلاح کی راہ صرف یہ نہیں کہ کوئی زبان سے کہہ دے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہوں۔ جیسا کہ مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ ان کا ایمان بانجھ ہوچکا ہے اور ان کی توحید فلسفہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لئے ایمان وتوحید کا نام لے کر بے ایمانی اور غیر اللہ کی بندگی میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے دنیا میں بھی مسلم قوم کو یہ سزا مل رہی ہے کہ مسلمان آج بحیثیت قوم انسانیت کی بلندیوں سے گر کر ذلت کے ہولناک گڑھوں میں گرچکے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کی اور تمام قوموں کی فلاح ونجات کی

واحد صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل و مکمل بندگی کو اختیار کیا جائے اور اس کی بندگی میں کسی قسم کے شرک کو گوارہ نہ کیا جائے۔

دین دار مسلمانوں کی اکثریت کے ایمان اور بندگی کا حال

اب ان مسلمانوں کے احوال کا ذکر یہاں مقصود نہیں، جو صرف نام کے مسلمان ہیں نہ روزہ نہ نماز، بلکہ مختصر طور پر یہاں ان دین دار مسلمانوں کے حالات اور ان کی اکثریت کے کردار کا جائزہ لیا جاتا ہے، جو بعض اسلامی اعمال پر پختگی سے کاربند نظر آتے ہیں۔

(۱) دین دار مسلمانوں کی اکثریت کو دیکھیں تو یہی نظر آئے گا کہ وہ نماز، روزہ و ذکر و عبادت میں تو پورے خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں مثلاً معاملات کو دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بجائے دوسروں کے قانون اور سرکشوں کی تہذیب کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں۔

(۲) مسلمانوں میں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں کہ انہیں یہ بات ذہن نشین ہے کہ اسلام اور بندگی صرف قلبی حسن نیت کی چیز ہے یا یہ کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان تعلق کا نام ہے اور انسان کے عملی برتاؤ، معاشرت اور معاملات سے اس کا سرے سے کوئی واسطہ ہی نہیں حالانکہ جس کا دل ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مربوط ہو اس کا لازمی نتیجہ تو یہی ہونا چاہئے کہ وہ اپنی زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھے اور اس کا ہر قول و فعل، ہر ارادہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کی تعلیمات کے مطابق ہو۔لیکن کیا کیا جائے کہ اس غلط رجحان نے مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ کو بیکار اور عملی برتاؤ اور معاملات کی زندگی میں نکما بنا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی سے دور ہٹا کر رکھ دیا ہے۔

(۳) دین دار مسلمانوں کی اکثریت اختلافی اور فروعی مسائل کی بنیاد پر تو ایک دوسرے کو کافر، بدعتی، ضال و مضل کہتے پھرتے ہیں لیکن یہی لوگ ہیں جو سود کو جائز قرار دینے والوں، اسلامی نظام کو ظالمانہ نظام قرار دینے والوں اور ملک و قوم میں اللہ تعالیٰ کے

قانون کے بجائے طاغوتی سرکش قانون کے حامیوں اور نافذ کرنے والوں اور فحاشی ،جھوٹ پھیلانے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ان کے جھنڈے لے کر ان کے حق میں زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔آخر یہ بھی شیطان کی بندگی[1] نہیں تو اور کیا ہے۔

(۴) مسلمانوں کے عوام نہیں بلکہ بہت سے خواص بھی مغربی جمہوریت کو گویا ایمانیات میں شامل کرتے ہیں حالانکہ جمہوریت کا خلاصہ یہ ہے کہ عوام کی حکمرانی ہو اور عوام کے من مانے قانون کو نافذ کیا جائے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں بھی اسلامی بل پر ووٹ ڈالے جاتے ہیں اور اس کے برعکس اسلام اور عبادت الٰہی کی رو سے جماعت اور نفس کے بجائے اللہ تعالیٰ کی حکمرانی ہوتی ہے۔آخر جو لوگ جمہوریت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کی جرأت کس منہ سے کرتے ہیں؟

(۵) وجداروں کا ایک خاص طبقہ ایسا ہے جس کے علماء ومشائخ ومبلغین اختلافی مسائل میں اپنی رائے پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ مخالف کو کافر، بدعتی یا مشرک قرار دیتے ہیں اس طرح وہ گویا حلال وحرام کا قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔تو ایک فروعی مسئلہ میں ،جس میں اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہو صرف اپنی رائے پر اس قدر اصرار کرنا کہ دوسروں کو مشرک ،کافر اور بدعتی قرار دے دیا جائے اس کے سوا کیا ہے کہ حلال وحرام میں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اپنے آپ کو بھی شریک کرتے ہیں۔یہی تو وجہ ہے کہ وہ صرف اس فروعی اختلاف کی بنیاد پر اسلام کی سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ایک مستقل نئے فرقہ کی بنیاد ڈال کر مسلمانوں کو

---

[1] وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ☆ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَلَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ☆ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ☆

''اور اے مجرموں آج کے دن تم (نیکوکاروں ،میرے خاص بندوں سے) الگ ہو جاؤ،اے آدم کی اولاد کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کر دی تھی کہ تم شیطان کی بندگی نہ کرنا وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور یہ کہ تم صرف میری بندگی کرو۔یہی سیدھا راستہ ہے (یٰسین۔آیت:۵۹تا۶۱)

ٹکڑے ٹکڑے[1] کر دیتے ہیں۔

(۶) مسلمانوں کے خواص کی اکثریت بھی فقہی اور فروعی مسائل میں اپنی رائے کو فروغ دینے اور اپنے مخالف کے ساتھ لڑنے کو جہاد اور اس وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں لیکن وہ اپنے ماتحتوں میں معروف مثلاً قنوت، خشوع، ایمان وتقویٰ، رحم وعدل اور انصاف وغیرہ جیسے جذبات اور ان جذبات کے مطابق کردار بنانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں اور نہ اپنے ماتحتوں کو کھلے ہوئے منکرات فحاشی، ظلم، بے انصافی، جھوٹ، غیبت، افتراء وغیرہ سے منع کرتے ہیں، تو آخر یہ خدا پرستی کے بجائے نفس پرستی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے بجائے اپنے نفس کی بندگی کرنے اور کرانے کے سوا اور کیا ہے؟ جس کی ممانعت قرآن مجید نے جگہ جگہ فرمائی جیسا کہ اس کا کچھ بیان پہلے گزر چکا ہے۔[2]

(۷) دین دار مسلمانوں کی اکثریت پر نظر ڈالیں تو یہی بات نظر آئے گی کہ دین کے چند وہ اعمال جو نظر میں آنے والے ہیں ان کو تو پورے شد و مد کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے، مستحبات کا خوب اہتمام ہوتا ہے، لیکن زندگی کے وہ فرائض وواجبات جن سے ان کا نفس کچلا جاتا ہے مثلاً سود سے بچنا، مال کے حصول میں ہر قسم کی حرام اور مشتبہ چیزوں سے بچنا، لوگوں کے حقوق کا خیال رکھنا تو ایسی چیزوں سے ان کی پوری زندگی خالی نظر آتی ہے۔

(۸) دینداروں کی اکثریت کو دیکھئے۔ جہاں ظاہری پاکیزگی کا سوال ہو تو ان کی حالت یہ

---

[1] "وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ"

"اور اس کی (خوف سے اس کی) نافرمانی سے بچتے رہو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور بہت گروہ ہو گئے، ہر گروہ (اور جماعت اپنے طریقہ پر) نازاں ہے جو اس کے پاس ہے"

[2] "أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ"

"کیا تم نے اس کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے" (جاثیہ۔ آیت: ۲۳)

ہوتی ہے کہ اگر ایک کھجور بھی راستے میں پالیں تو اس کو اٹھا کر اعلان کرتے ہیں کہ یہ کس کی ہے؟ لیکن یہی پارسا شخص یتیموں کا مال، مدرسہ، مسجد، لنگر یا اپنے آپ کو زکوٰۃ کا مستحق بتلا کر اور اسی طرح بہت سے دوسرے طریقوں سے مال ہڑپ کر کے مطمئن ہے کہ میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دین اسلام کا مفکر، مبلغ اور انتہائی پرہیزگار بھی ہوں۔ حالانکہ اس کی یہ ساری مشغولیت دین کے نام پر دنیا کا ایک کاروبار ہوتا ہے آخرت کے بجائے دنیا کے حصول کی کوشش ہوتی ہے اور تقویٰ اور بندگی کے نام پر فسق اور غیر اللہ کی بندگی ہوتی ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ صرف ایک گمراہی اور شیطان کی بندگی نہیں بلکہ اس پر ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی بھی ہے۔

(۹) مسلمانوں کی اکثریت بلکہ دین داروں اور مسلمانوں کے خواص کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف آرزوؤں اور تمناؤں کی زندگی گزارتے ہیں اور اسلام اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو فارغ سمجھ کر صرف چند پڑھنے کی چیزوں اور صرف چند بے جان اعمال جس میں زیادہ محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ زیادہ جان و مال کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ وہ پڑھ کر یا لوگوں کو چند پڑھنے والی چیزیں بتلا کر صرف اسی بنیاد پر لوگوں کو جنت کا ٹکٹ دے دیتے ہیں اور خود بھی اور لوگوں کو بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بندگی سے دور کرتے ہیں اور ان کی آخرت کو تباہ و برباد کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑھنے کی چیزیں فائدہ سے خالی نہیں لیکن ان کو جس انداز سے بتایا جاتا ہے تو اس کا مطلب گویا یہی ہوتا ہے کہ بس اگر یوں پڑھو تو صرف اسی کی وجہ سے تمہیں جنت مل جائے گی اور تم اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے والے بن جاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا پڑھنے والا قانع ہو جاتا ہے کہ بس نجات میرے لئے مقدر ہوگئی ہے اور میری جنت و نجات بالکل محفوظ ہے۔ جس کے بعد وہ اسلام کی ذمہ داریوں، فرائض، معاملات، معاشرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کی بندگی سے غافل اور بے پرواہ ہو جاتا ہے اور یہی حال ان مذہبی فرقوں کا ہے کہ وہ صرف اپنے فرقہ کی بنیاد پر اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکیدار سمجھتے

ہیں جب اہل کتاب کی یہی حالت ہوگئی، تو قرآن مجید نے ان پر سخت تنقید کی اور فرمایا۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

''اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو یہودی ہوں یا نصاریٰ یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں (ان سے کہو کہ اس بات کو ثابت کرنے پر) اپنی دلیل لاؤ۔ اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو۔'' (بقرہ۔ آیت:۱۱۱)

اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بار بار متنبہ کردیا کہ دنیا و آخرت میں راحت، حیات طیبہ اور جنت اس قدر سستی نہیں کہ صرف زبان سے کہنے اور کچھ پڑھنے یا چند بے جان اعمال اور اسلامی رسومات کی ادائیگی سے کوئی جنت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے کہ

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ

ترجمہ: ''کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے تم سے ان لوگوں کو الگ نہیں کیا۔ جنہوں نے (ہر رکاوٹ سے اور ظاہر اور باطن کے دشمن سے لڑکر) جہاد کیا اور نہ ان کو الگ کیا ہے جو (ہر حال میں حق پر) ثابت قدم رہنے والے ہیں۔'' (آل عمران۔ آیت:۱۴۲)

(۱۰) مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ جب کسی معاملے، جھگڑے اور تنازعے میں اسے فائدہ طاغوتی نظام میں نظر آ رہا ہو، تو وہ اس کی طرف بھاگتا ہے اور جب اسے معلوم ہو جائے کہ میں ہی حق پر ہوں اور اب اسلامی قانون جو عدل و انصاف کا قانون ہے اسی میں ہمیں انصاف ملے گا تو پھر یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی بندگی کی بجائے دنیا پرستی کی وجہ سے شریعت اسلامی کی طرف دوڑتا ہے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کے لئے صاف فرمادیا ہے کہ یہ

مومن نہیں بلکہ منافق ہیں اور ایسے لوگ ایمان واسلام کے دعویٰ کے باوجود منافق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے بجائے دنیا پرستی اور شیطان کی بندگی میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس پر جو حکم تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو تم سے پہلے نازل کیا گیا ہے (پھر بھی اس کے باوجود) وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے معاملات اور فیصلے طاغوت (اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون سے سرکش اور شریروں) کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں اس (طاغوت) کے انکار کا حکم دیا گیا ہے (مگر وہ شیطان کی بات مان کر پھر بھی ان شریروں کے پاس جاتے ہیں) اور شیطان تو چاہتا ہے کہ انہیں نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے" (نساء۔ آیت:۶۰)

ایک دوسری جگہ منافقین کی خصلت بیان کرکے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ

"اور اگر حق ان کے لئے ہو (اور ان کو حق ملتا ہو) تو اس کی طرف (فرمانبردار) دوڑے چلے آتے ہیں۔" (النور۔ آیت:۴۹)

ایمان اور اسلامی اعمال کے نتائج اور سچے مومن کی صفات اور کردار

سابقہ بیان سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ توحید وایمان زبانی جمع خرچ یا محض دعویٰ کا نام نہیں اور صرف یہ کہنا کہ میں مومن ہوں یا توحید کی باریکیوں کو بیان کرنا یا یہ کہ میں موحد ہوں۔ انسان کو مومن اور موحد اور خدا کا بندہ بنا سکتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات یہ امید ہوتی ہے کہ انسان ایک چیز کی نیت کرتا ہے یا ایک چیز کا دعویٰ کرتا ہے اور حالات اس کو بتاتے ہیں کہ تیری نیت سچی نہ تھی بلکہ صرف آرزو تھی اور تیرا ایمان واقعی ایمان نہ تھا بلکہ

محض ایک دعویٰ تھا جس کو حالات نے جھوٹا ثابت کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ

" اور لوگوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ (سچے) مومن نہیں ہیں۔" (بقرہ۔ آیت:۸)

موحد، مومن اور اللہ تعالیٰ کا سچا بندہ کون ہے؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر سچا مومن اور موحد کون ہے؟ تو اس کا آسان جواب یہی ہے کہ جس طرح ہر درخت اپنے پھول اور پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح مومن کو اس کے عمل اور کردار سے پہچانا جاتا ہے لیکن کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ بعض لوگ دجل وفریب کی وجہ سے اعمال صالحہ اور مومن کے کردار کو اختیار کر لیتے ہیں حالانکہ ان کے یہ اعمال و کردار ایمانی صفات کی وجہ سے نہیں بلکہ ریا کاری، دنیا پرستی، منصب، مال وجاہ کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور آزمائش اور حالات کے آنے پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ پھل و پھول ایمان سے نہیں بنے تھے بلکہ صرف نمائشی اور کاغذی پلاسٹک کے پھول تھے۔ اس لئے یہاں مومن کے کردار کے ساتھ مومن کی بعض صفات کو بھی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ جس کو توفیق ہو جائے اسی طرح اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرے۔

ایمان کی اصل امن سے ہے:

ایمان، امن سے ہے اور امن اطمینان اور خوف سے محفوظ ہونے کی حالت کو کہتے ہیں اور مومن امن دینے والے کو کہا جاتا ہے یعنی جس پر بھروسہ اور اعتماد کر کے انسان بے فکر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین ہو اور اس کو تمام صفات کمال کا مالک اور سرچشمہ یقین کرے اور کائنات کی تخلیق، اس کی بقاء اور اس کی تدبیر اور اس میں تصرف اور نفع ونقصان اور زندگی و موت کا مالک صرف وہی ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ اس لئے وہ صرف ایک ہی ہستی ہے جس کی تعلیم و ہدایت اور اس کے قانون پر پورا پورا بھروسہ کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس رسالہ کا موضوع اور مقصد تمام ایمانیات کا بیان نہیں

بلکہ مومن کی کچھ صفات کا بیان ہے اور صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ مومن کے نام ہی سے واضح ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون اور اللہ تعالیٰ کی اس وحی پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور بالآخر محمد رسول اللہ ﷺ پر اتاری ہے، پورا پورا اعتماد رکھتا ہے اور اسے اعمال کے نتائج اور آنے والی ابدی زندگی پر پورا پورا یقین اور اعتماد ہوتا ہے۔ اور ایسے شخص کی صفات، جذبات اور کردار یہی ہو سکتا ہے جو ذیل میں آ رہا ہے۔

جب مومن کو یہ حقیقت خوب معلوم ہو جائے کہ نفع و نقصان صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ و قدرت میں ہے تو لازماً وہ صرف اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتا رہے گا اور یہی چیز اسے دوسری چیزوں کے خوف سے اور بے اطمینانی سے محفوظ کرتی ہے اور اس کا دل امن، بے خوفی اور اطمینان کا سمندر بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب ان کی مشرک قوم نے اپنے معبودانِ باطل سے ڈرایا دھمکایا تو آپ کا جواب یہ تھا۔

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ

"(جب کائنات کی تمام چیزیں اپنی زبان حال سے یہ پکار پکار کر کہتی ہیں کہ وہ مختار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین میں جکڑے ہوئے بے بس ہو کر اپنے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں تو) آخر میں ان ہستیوں اور ان چیزوں سے کیوں ڈروں جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا لیا جب تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لئے اس نے کوئی سند اور دلیل تم پر نہیں اتاری (سو ڈرنا تو تمہیں چاہئے کہ اللہ تعالیٰ جیسی ہستی مختار کل کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہو اور میں تو صرف اسی اللہ تعالیٰ کو مانتا ہوں، جس کی قدرت، اختیار اور معبود ہونے پر پوری کائنات کی گواہی اور مضبوط دلیل موجود ہے جس کو تم بھی مانتے ہو اور پوری کائنات میں اس بات کی گواہی اور دلیل موجود ہے کہ یہاں صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی کا ارادہ کام کر رہا ہے اور اس کے خلاف کوئی ایسی دلیل موجود نہیں کہ اس کے ساتھ قدرت و اختیار میں شریک ہو) تو (اب

بتاؤ کہ) دونوں فریقوں میں سے (اللہ تعالیٰ کے عذاب سے) امن کا زیادہ مستحق کون ہے۔ اگر تم جانتے ہو (یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ لوگ زیادہ امن کے مستحق ہیں) جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو کسی ظلم (یعنی نقصان اور شرک) سے آلودہ نہیں کیا تو انہی کے لئے امن ہے اور وہی سیدھی راہ پر ہیں۔" (انعام۔ آیت:۸۱تا۸۲)

مومن پر اعتماد کیا جاتا ہے:

مومن پر اعتماد کیا جاتا ہے یعنی وہ اپنے سے باہر دنیا کو اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا اطمینان دلاتا ہے اور وہ اپنے کردار سے ثابت کرتا ہے کہ واقعی اس کی زبان، آنکھوں، کانوں، ہاتھ پاؤں اور اس کے قول وفعل کے ضرر سے لوگ محفوظ ہیں۔ اور اس کے لین دین، تجارت، قرض لینے دینے غرض ہر معاملہ سے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے زبان وعمل سے کبھی کسی کو دغا اور دھوکہ نہیں دیتا اور نہ کسی معاملہ میں وہ خیانت کرتا ہے۔ کیونکہ مومن امین ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ملی ہوئی چیزیں امانت ہیں۔ اس لئے وہ ہر کام ہر چیز میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے کہ کہیں خیانت نہ ہو اور اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہوتا ہے کہ وہ اس کے ظاہر وباطن کو دیکھ رہا ہے اور اس سے کسی کی کوئی اور کسی طرح کی خیانت بھی چھپ نہیں سکتی۔

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ

" اللہ تعالیٰ جانتا ہے نگاہوں کی خیانت (اور چوری) کو اور ان باتوں کو بھی جن کو سینے چھپائے ہوئے ہیں۔" (المؤمن۔ آیت:۱۸۔۱۹)

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ

" مَن غش فليس منی "

"جس نے دھوکہ دیا تو وہ مجھ سے نہیں۔" (صحیح مسلم، مشکوٰۃ کتاب البیوع)

مومن پوری طرح ایمان کی روشنی میں چلتا ہے:

مومن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی وہم وگمان کی بجائے ٹھوس حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔وہ نہ کسی کو بلا تحقیق گرفتار کرتا ہے نہ بلا تحقیق سزا دیتا ہے، نہ جھوٹی شہادت و گواہی دیتا ہے اور نہ سنی سنائی باتوں اور افواہوں کو پھیلاتا ہے نہ وہ بغیر علم و دلیل کے کسی کی پیروی کو اختیار کرتا ہے اور نہ وہ بلا دلیل و برہان کے کوئی عقیدہ بنالیتا ہے اور نہ آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے چلتا ہے اور یہی طرز، علوم و فنون اور زندگی کے تمام شعبوں میں اختیار کر کے پوری روشنی میں چلتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی آنکھ، کان، دل و دماغ اور عقل کو استعمال کر کے صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔مومن کا یہی رویہ عقل وفطرت کے عین مطابق ہے اور اس کے بارے میں اسے اللہ تعالیٰ کے ارشادات خوب معلوم ہوتے ہیں۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ

''یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کو صحیح استعمال نہیں کرتے۔'' (انفال۔آیت:۲۲)

نیز ارشاد ہے کہ

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ

''بے شک سب جانداروں میں بدترین وہ لوگ ہیں جنہوں نے (آنکھ، کان، دل ودماغ سے کام نہیں لیا اور) حق کا انکار کیا پس (اسی وجہ سے) وہ ایمان نہیں لاتے۔''

(انفال۔آیت:۵۵)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا

''اور ایسی چیز اور بات کے پیچھے نہ لگو جس کا تم کو علم نہیں (بلکہ خوب تحقیق کر کے چلو اور تحقیق کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی آنکھوں اور کانوں اور دل وعقل سے کام لے کر صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرو) اگر ایسا نہیں کرو گے تو گھاٹے اور نقصان میں پڑ جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ

کی عدالت میں مجرم ہو جاؤ گے) بے شک کان اور آنکھ اور دل ہر ایک چیز کے متعلق باز پرس ہوگی (کہ تم نے اسے کیوں صحیح استعمال نہیں کیا) '' (بنی اسرائیل ۔ آیت :۳۶)

مومن تمام ذمہ داریوں کو حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے اور وہ اس کا امین بھی ہوتا ہے کیونکہ ایک مومن صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے اور اسی کی بات پر اعتماد کرتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ حقوق میں نقصان کرنے کو اپنے لئے دنیا و آخرت کے لئے زہر قاتل سمجھتا ہے اور اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رہتا ہے کہ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ

'' افسوس (اور خرابی) ہے ناپ تول (اور حقوق کی ادائیگی) میں کمی کرنے والوں کے لئے جو لوگوں سے ناپ کر لیں (یعنی اپنا حق لیں) تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں (یعنی ان کو حقوق کی ادائیگی کا مسئلہ ہو) تو گھٹا کر دیں '' (المطففین ۔ آیت ۱ تا ۳)

اس لئے وہ تمام حقوق جو اللہ تعالیٰ نے اس کے ذمہ عائد کئے ہیں وہ انہیں بحسن و خوبی ادا کرنے کے لئے کمر بستہ رہتا ہے اور کسی حق میں کوئی کوتاہی، سستی اور کمی نہیں کرتا نیز اس لئے بھی وہ حقوق کا اہتمام کرتا ہے کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ ہر حق ایک امانت ہے ۔ ہر ذمہ داری ایک امانت ہے ۔ ہر منصب ایک امانت ہے ۔ اس لئے ایک مومن ہر ذمہ داری اور ہر ذی حق کو اسکا حق حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے اور ایمانی معاشرہ لوگوں کے حقوق کا امین بھی ہے اس لئے وہ ہر ذی حق کو اسکا حق خود بھی دیتا ہے اور دوسروں سے دلوانے کا کام بھی کرتا ہے یعنی صرف وہ حق کو خود ادا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے ذمہ بھی لوگوں کے جو حقوق واجب اور ضروری ہوتے ہیں ان کی ادائیگی اور ان کو دلوانے کا بھی اہتمام اور انتظام کرتا ہے اور جو جس ذمہ داری اور جس منصب کا اہل ہو وہ منصب اور ذمہ داری اس کے سپرد کرتا ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا

'' بے شک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے (اپنے اصل) حقداروں کو

پہنچادو۔'' (سورہ نساء۔آیت:۵۸)

مومن کا اللہ تعالیٰ کے متعلق اچھا گمان رکھنا اور اس سے امید رکھنا:

یہ دونوں اوصاف لازم وملزوم ہیں کیونکہ ایمان نام ہی اس عظیم اور اعلیٰ و برتر طاقت کو تسلیم کرنے کا ہے جو اس کائنات کا انتظام کر رہی ہے جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں جو کسی کام سے عاجز نہیں اور وہ ہے بھی ایسی ہستی کہ مجبور اور مضطر کی پکار کو سنتی ہے اور جواب دیتی ہے۔ وہ رحیم وکریم بھی ہے اور اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان بھی ہے۔ جتنی کہ ایک ماں اپنے بچے پر ہوتی ہے اور اس کی مشکلات اور مصیبت کو دور کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے تو ایسی ہستی کو ماننے والا اپنے پروردگار کے ساتھ اچھا گمان کیوں نہیں رکھے گا اور ایسی ہستی کو ماننے والا ناامید کیسے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مومن سے کوئی گناہ صادر ہوتا ہے تو وہ سچی توبہ اور اپنی اصلاح کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے پوری امید رکھتا ہے کہ وہ اسے معاف کرے گا اور جب وہ لڑتا ہے تو کامیابی کی مضبوط امید سے لڑتا ہے۔

وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ

''اور یہ کہ بے شک ہمارا لشکر غالب ہونے والا ہے۔'' (الصّٰفّٰت۔آیت:۱۷۳)

اور جب وہ بیمار ہوتا ہے تو صحت کی پختہ امید کے ساتھ مرض کا مقابلہ کرتا ہے۔

'' وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ''

''اور جب بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتے ہیں''

جب اس پر تنگی اور مشکلات کا وقت آتا ہے تو ان مشکلات میں بھی راحت وسرور اور اطمینان پاتا ہے وہ یہ امید رکھتا ہے کہ ان مشکلات اور تنگی کے بعد ضرور فراخی اور کشائش اور راحت کا وقت آئے گا۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

''پس یقیناً ہر سختی (اور مشکل) کے ساتھ آسانی ہے۔'' (سورہ الم نشرح۔آیت:۵)

اور جب اسے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

"ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنا ہے" پڑھتے ہوئے اسی حادثہ ہی میں اسے ایک پختہ تسلی بھی ملتی ہے اور ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے اجر کا امیدوار بھی رہتا ہے۔ وہ جب دنیا میں کفر و باطل اور فحاشی اور ظلم و بربریت کا غلبہ دیکھتا ہے تو وہ کسی نا امیدی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ باطل کے زوال اور حق کے غلبے کا پختہ یقین کر کے باطل کے خلاف کھڑا رہتا ہے۔

إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

"بے شک باطل ہی مٹنے والا تھا۔" (بنی اسرائیل۔ آیت: ۸۱)

اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے منکر اور مشرکین میں اور اسکے بعد ان لوگوں میں جن کا ایمان بہت کمزور ہوتا ہے درجہ بدرجہ نا امیدی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کا عنصر موجود رہتا ہے کیونکہ ایسے لوگوں کی نظر صرف مادی وسائل پر اور ظاہری اسباب پر ہوتی ہے اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ دنیا کے اسباب اور ساری چیزیں عارضی ہوتی ہیں۔ اس لئے جب ان کے پاس وسائل اور اسباب نہیں رہتے، جنھیں اس نے سب کچھ سمجھ رکھا ہے تو ان پر مایوسی چھا جاتی ہے کیونکہ یہ منکرین خدا اور مشرکین تو اسباب کے بندے ہوتے ہیں جب کہ مومن صرف خالق و مالک اسباب کا بندہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسباب کے حصول اور اس کے خرچ کرنے میں منکر حق اور مشرک اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑنے والا ہوتا ہے جبکہ مومن اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں اسباب کو ٹھکرانے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس قول کو یوں نقل فرماتے ہیں۔

وَلَا تَايْـَٔسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۖ إِنَّهُ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

"اور تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تو صرف کافر (اور منکر حق) لوگ ہی نا امید ہوتے ہیں۔" (سورہ یوسف۔ آیت: ۸۷)

مؤمن اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں راضی رہتا ہے:

مؤمن کی کیا شان؟ وہ تو ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے راضی رہتا ہے۔ وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے متعلق بدگمان اور اس سے ناراض نہیں ہوتا اور نہ وہ گھبراہٹ اور سراسیمگی میں مبتلا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم اور رحمٰن ورحیم ہے۔ اس لئے اس کا کوئی فعل عبث اور فضول اور حکمت ومصلحت کے خلاف نہیں ہوسکتا اور حکیم ورحیم ذات خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا نہیں کرتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ رب العالمین اپنے بندوں کے لئے ان کے ماں باپ سے لاکھوں گنا سے کہیں زیادہ شفیق اور مہربان ہوتا ہے اور سراسر عدل ورحمت ہے پھر کس طرح ممکن ہے کہ اس کا کوئی فعل عدل وحکمت اور رحمت کے خلاف ہو اس لئے ایک مؤمن کو اگرچہ کسی کام میں بظاہر کراہت اور ناپسندیدگی نظر آتی ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت اور رحمت ضرور چھپی ہوئی ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

”اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز پسند کرو اور وہ تمہارے لئے (عاقبت اور انجام کے لحاظ سے) شر اور بری ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ عاقبت اور انجام کے اعتبار سے تمہارے لئے خیر ہو اور اللہ تعالیٰ ہی ایسی ذات ہے جو ہر چیز ہر حالت اور اس کے انجام ونتائج کو جانتا ہے۔“ (بقرہ:۲۱۶)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا

”پس ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں (تمہارے لئے) خیر کثیر رکھ دیں۔“ (نساء آیت:۱۹)

مومن اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق وعزت پر راضی رہتا ہے وہ دوسروں سے جلتا نہیں:

مومن اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق وعزت ومنصب پر راضی رہتا ہے۔ وہ اس بارے میں دوسروں سے حسد نہیں کرتا۔ کیونکہ مومن کا ایمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم وعلیم اور مہربان ذات ہے اور موجودہ زندگی عارضی ہے۔ جس میں رہ کر آخرت کے لئے توشہ لینا ہے اور پوری طرح روحانی صحت یاب ہو کر آخرت کی ابدی زندگی کی طرف ہمارا سفر جاری ہے۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم رزق اور تقسیم عزت ومنصب اور اس کی عطا پر خواہ زیادہ ہو یا کم ہو، بہر حال راضی اور خوش رہتا ہے اور وہ اپنے پاس ہر

موجود نعمت کو سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل تصور کرتا ہے اور اسے یہ خوب معلوم ہوتا ہے کہ بس ہمارا فائدہ اور نفع اور روحانی صحت یابی اسی میں ہے جیسا کہ مہربان اور سمجھ دار طبیب کے ہسپتال میں پڑے ہوئے مریض اپنے ڈاکٹر اور طبیب کی طرف سے ملنے والی غذا اور دواؤں پر مطمئن رہتے ہیں اور غذاؤں اور دواؤں کے متعلق دوسرے مریضوں سے کسی طرح نہیں جلتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میرے مرض کے مطابق یہی غذا اور یہی دوا ہے تو وہ پھر دوسروں سے کیوں جلے؟ اور کیوں حسد کرے۔ اسی طرح مومن کو نہ تو اللہ تعالیٰ سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اسے حکیم اور عادل اور مہربان یقین کرتا ہے اور نہ اپنے سے زیادہ دولت مند اور غیر دولت مند لوگوں سے جلتا ہے بلکہ اپنی محنت اور کوشش کے ثمرات اور نتائج صبر وشکر کے ساتھ قبول کر کے اللہ تعالیٰ سے راضی اور اس پر قانع رہتا ہے۔

اس کے برعکس لالچی اور بے ایمان شخص لوگوں کے حسن وصحت، کمال اور عزت ومال کی وجہ سے جلتا رہتا ہے اور محنت کے میدان میں دوڑنے کے بجائے دوسروں کی ٹانگیں کھینچتا رہتا ہے اور لوگوں کی تحقیر وتذلیل بیان کرنے میں مزہ محسوس کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی زندگی بہت ہی تھکی ماندی رہتی ہے اور ہر وقت اس کے دل میں خوف، غم اور

غصہ اور بے چینی کی آگ سلگتی رہتی ہے۔

مومن کو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہوا کرتی ہے:

مومن کو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہوا کرتی ہے کیونکہ مومن کا اس حقیقت پر ایمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام صفات کمال اور حسن و جمال کا مالک ہے اور صرف وہی حاجت روا اور مشکل کشا ہے وہی ہر چیز کا خالق و مالک ہے اور پھر یہ کہ وہ اپنے بندوں سے بہت محبت رکھتا ہے اور مہربان ہوتا ہے اور اسی نے ہمیں ظاہری و باطنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے اور اسی نے ہم پر احسان کیا ہے اور صرف وہی لطف اور احسان کا سرچشمہ ہے اور فطرت انسانی بھی ہے کہ اسے ایسی چیز سے محبت ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ایمان سب سے پہلے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرتا ہے اور مومن کو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہوا کرتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

"اور جو ایمان لائے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت رکھتے ہیں۔" (بقرہ۔ آیت:۱۶۵)

اور جب اللہ تعالیٰ سے شدید محبت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اس محبت کی وجہ سے بھی اپنے آپ کو اور دنیا کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں قربان کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی کتاب سے، اس کے قانون سے اور اس کی راہ میں جدوجہد اور اس کے لئے سر قربان کرنے کی بھی شدید محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ورنہ وہ محبت اور ایمان میں جھوٹا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

"کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ (آباؤ اجداد) اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں، پوتے، پوتیاں وغیرہ) اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ جو تم نے خود

کمائے ہیں اور وہ (چلتی ہوئی) تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو یہ سب تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیج دے (اور جن لوگوں کو مذکورہ بالا چیزیں اللہ تعالیٰ اس کے رسول ﷺ اور اس کے نظام کے قیام وبقاء کی راہ میں جدوجہد سے زیادہ محبوب[1] ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ان کے لئے بت ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھاگنے والے اور نافرمان بن جاتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ (ایسے) نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (توبہ۔آیت:۲۴)

بہر حال جب اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے تو اس کی کتاب اور اس کی کتاب سکھانے والے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ سے بھی محبت ہو جاتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے بھی جو نبی کریم ﷺ کے بلا واسطہ شاگرد ہیں۔ جن پر آپ ﷺ کی بلا واسطہ توجہ پڑ گئی تھی۔ ان سے بھی محبت ہو جاتی ہے اور جب محبت آ جاتی ہے تو محبوب کی تنقیص اور اس پر تنقید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، محبوب پر تنقید اور اس کی تنقیص وہی کرتا ہے جو محبت میں جھوٹا ہو۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے بھی محبت رکھتا ہے اور زندگی سے صرف اس لئے محبت رکھتا ہے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت اور عظیم سرمایہ سمجھتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کو حاصل کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے گا۔ اس لئے وہ اس پر شاکر رہتا ہے اور وہ موت سے بھی اس لئے محبت رکھتا ہے کہ وہ موت کو ملاقات خداوندی کے لئے ایک پل سمجھتا ہے جب موت اور پل سے

---

[1] جب آدمی کے سامنے دو متضاد مطالبے آ جائیں ایک طرف اللہ تعالیٰ اور رسول اور اللہ تعالیٰ کے دین کی راہ میں جد وجہد اور جہاد کا مطالبہ ہو اور دوسری طرف مذکورہ چیزوں میں کسی چیز کی محبت کا مطالبہ ہو تو ایسی صورت میں اگر آدمی اللہ تعالیٰ اور رسول کے مطالبے کو نظر انداز کر کے دوسری چیز کے مطالبہ کو ترجیح دیدے تو اس کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے زیادہ اس کو وہ چیز محبوب ہے تو ایسی صورت میں یہی چیز اس کے لئے بت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مطالبہ کو مقدم رکھے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ محبوب ہے۔ یہ محبت الٰہی اور حب رسول ﷺ کے جانچنے کے لئے ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے ہر شخص اپنی روز مرہ زندگی میں اپنے ایمان اور اپنی محبت کو پرکھ سکتا ہے۔

دیدار الٰہی حاصل ہو تو وہ اسے کیوں محبوب نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ سے محبت ہو جاتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی مخلوق انسانوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے۔ اور وہ صرف ایک ہی کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور وہ ہے شیطان۔ کیوں کہ شیطان اللہ تعالیٰ کا اور انسان کا دشمن ہے۔

إِنَّ الشَّيْطَٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا

''بلاشبہ شیطان تمہارا دشمن ہے تم اس کو دشمن ہی سمجھو'' (فاطر آیت:٦)

اور قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ محبوب کا محبوب، محبوب اور محبوب کا دشمن، دشمن ہوتا ہے۔

'' مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ ''

''جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کی اور اللہ تعالیٰ کے لئے بغض کیا اور اللہ تعالیٰ کے لئے دیا اور اسی کے لئے منع کیا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر دیا۔''

(ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

مومن شیطان کے جال میں پھنسے ہوئے لوگوں کو آزاد کرانے کی حتی الوسع کوشش کرتا ہے

مومن کی حد درجے کوشش ہوتی ہے کہ انسانوں کو شیطان کے اثرات اور اس کی دوستی سے بچا کر ہلاکت سے بچائے اور وہ انسانیت کو شیطان اور شیطانی قوتوں کے پنجوں اور غلامی سے اور مصیبت میں پھنسے ہوئے لوگوں کو آزادی دلانے کی انتھک کوشش کرتا ہے اور انھیں کامیابی کی راہ سمجھاتا ہے۔ ''فَكُّ رَقَبَةٍ'' ''غلاموں (پھنسے ہوئے لوگوں) کی گردن آزاد کرنا'' (سورہ البلد۔ آیت:١٣)

اور وہ مخلوق کو ہر طرح کا سامان آرام و راحت پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی کو کامیابی کا راستہ مانتا ہے۔

أَوْ إِطْعَٰمٌ فِى يَوْمٍ ذِى مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَتَوَاصَوْا۟ بِٱلصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا۟ بِٱلْمَرْحَمَةِ ۝ أُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلْمَيْمَنَةِ

"یا بھوک کے زمانے میں کھانا کھلانا، قرابت دار (رشتہ دار) یتیم کو یا خاک نشین محتاج کو پھر وہ ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی اور رحم (مہربانی و ہمدردی) کی نصیحت کی۔ یہی لوگ "اصحاب المیمنہ" (یعنی بابرکت نصیب والے) ہیں۔" (البلد آیت:۱۴ تا ۱۸)

وہ کسی کو نہ خود ایذاء پہنچاتا ہے نہ دوسروں کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ کسی کو ایذاء پہنچائیں اور ایمان والا اس بات کو خوب جانتا ہے کہ وہ اگر اپنے پڑوسی اور قریبی لوگوں کو اپنی ایذاء رسانیوں اور لوگوں کی ایذاء رسانیوں سے امن نہیں دے سکتا تو اس کے اندر ایمان کا جوہر کہاں باقی رہ گیا ہے؟ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔

" واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن قیل من یا رسول اللہ قال الذی لا یأمن جارہ بوائقہ "

"اللہ کی قسم مومن نہیں، اللہ کی قسم مومن نہیں، اللہ کی قسم مومن نہیں (صحابہ کرام میں سے) کسی نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کون ہے؟ (جو مومن نہیں) تو آپ ﷺ نے فرمایا (یہ وہ شخص ہے) جس کی ایذاء رسانیوں سے اس کا پڑوسی محفوظ و مامون نہ ہو۔" (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق)

نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

" لیس المؤمن الذی لیشبع و جارہ جائع الی جنبہ "

"وہ شخص مومن نہیں جو خود سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے اور اس کے ساتھ پڑوسی بھوکا رہتا ہے۔" (مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ)

مومن کسی کو ایذاء و تکلیف کیسے پہنچا سکتا ہے۔ وہ تو اتنا مہربان ہوتا ہے کہ پہلے تو آخری حد تک یہ کوشش کرتا ہے کہ تمام انسان شیطانی اثرات، ظلم وغیرہ سے چھٹکارا حاصل کرلیں اور جب وہ کسی انسان کو دیکھتا ہے کہ اس سے شیطانی اثرات بالکل ختم نہیں ہوتے اور شیطان نے اس میں اس قدر تصرف کیا ہے کہ اب وہ خود شیطان بن گیا ہے اور انسانیت کا دشمن بن گیا ہے، تو پھر وہ اس سے نمٹ لیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی انسان کسی انسان یا

انسانیت پر ظلم کرتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ روکنے کے لئے فوراً اٹھ کر "لاتذر" کا نعرہ لگا کر اس کے ظلم و بربریت کا صفایا کرتا ہے۔

جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام قبطی سے نمٹے اور فرعون کی ہلاکت کے بعد دوسرے دشمنوں سے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ شیطانی قوتوں سے لڑے اور ان کو زیروزبر کیا۔ البتہ داعی حق کو بعض اوقات لڑنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ لوگوں پر حجت تام نہیں ہوتی یا داعی حق اس وقت اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ اس وقت دشمن سے مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا ہے اور یہ جان بھی امانت ہے اور اس میں بولتا ہوا حق بھی، جس کا دوسروں تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اپنی جان کے لئے نہیں بلکہ حق کی حفاظت کی خاطر ہجرت کرتا ہے یا پھر یوں دعا مانگتا ہے کہ

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا

"اے میرے رب تو ان منکرین حق کو زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کردیں گے اور ان سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر (سخت منکر حق) ہی ہوگا۔" (نوح۔ آیت: ۲۶ تا ۲۷)

خلاصہ یہ ہوا کہ مومن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوشش اور جہاد سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اخلاق کا مظہر ہوتا ہے۔ اس سے محبت، شفقت اور ہمدردی کی خوشبو مہکتی رہتی ہے اور حق والوں کے لئے پھول اور مہربان ہوتا ہے اور باطل اور ظلم سے سخت بیزار ہوتا ہے اور شیطانی قوتوں اور منکرین حق کے مقابلہ میں بہت سخت ہوتا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

"محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ منکرین حق پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔" (الفتح۔ آیت: ۲۹)

پس مومن اپنا غصہ و غضب شیطان اور جو شیطان کا بھائی بن چکا ہے، اس کے خلاف

بہا کر انسانیت پر رحم اور مہربانی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی محبت کا ثبوت دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ

''اور جن لوگوں نے انکار حق کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت اور شیطان سرکش کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم (بھی) شیطان کے ساتھیوں اور حامیوں سے خوب لڑو''

(نساء آیت:۷۶)

دیکھیے مومن کیسی محبت والا اور کیسا رحم دل اور امانت دار ہوتا ہے اور اس کی زندگی کیسی خوشگوار ہوتی ہے۔ اور جب اسے اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ حسد کیسے کرسکتا ہے۔ وہ اس کی مخلوق اور بندوں کا خیر خواہ ہوتا ہے تو ایسی صورت میں حسد کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔ وہ تو ہر شخص کے لئے خیر کا طالب ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کر کے اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر کیسے معترض ہوسکتا ہے؟ وہ تو اللہ تعالیٰ کے ہر کام اور تقسیم پر خوش اور راضی ہوگا۔

بلکہ جس کو محبت کا بلندترین درجہ حاصل ہو تو وہ تو اپنی ذات پر اپنے مسلمان بھائی کو ترجیح دے گا۔ وہ اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت سے مقدم سمجھے گا۔ وہ خود بھوکا پیاسا رہ کر دوسرے بھائیوں کی شکم سیری ہی میں راحت وسکون اور لذت پائے گا۔ خود مشقت اٹھائے گا مگر اپنے بھائی کے لئے راحت کا سامان کرے گا۔

وہ دوسروں کو آگے بڑھا کر انہیں عزت کے مقام پر فائز ہونے کا خواہاں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی ایمان والوں کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

''اور جو لوگ پہلے سے دار الہجرۃ دار الاسلام (یعنی مدینہ منورہ) میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کئے ہوئے ہیں جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آئے (یا آتے) ہیں وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس سے اپنے

دلوں میں تنگی محسوس نہیں کرتے اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود ان کو سخت حاجت کیوں نہ ہو (پھر وہ ان کی ضروریات کو مقدم رکھتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کو اپنے نفسوں کی لالچ سے بچا لیا گیا ہے) اور جو شخص اپنے جی کی لالچ سے بچا لیا گیا تو یہی ہیں وہ لوگ جو فلاح پانے والے ہیں۔" (حشر۔آیت:۹)

مومن مخلوقِ خدا پر مہربان ہوتا ہے

مومن اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر مہربان ہوتا ہے کیونکہ جس شخص کی اللہ تعالیٰ سے سخت محبت ہوا کرتی ہے تو محبوب کی صفات محبّ اور عاشق کے اندر اور آقا کی صفات اس کے بندہ میں دکھائی دیتی ہیں اور محبّ و عاشق و بندہ خود بھی محبوب کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رحم اللہ تعالیٰ کی سب سے نمایاں اور غالب صفت ہے اس لئے مومن کے اندر رحم، کرم وخدمت کی صفت خاص طور پر نفوذ کرتی ہے۔

اور اس سے رحم و کرم اور خدمت خلق کے چشمے اور اعمال پھوٹتے نظر آتے ہیں اور اس کی یہ مہربانی صرف نوع انسانی تک محدود نہیں رہتی بلکہ جانوروں تک کے ساتھ رحم و کرم کا سلوک کرتا ہے اور دوسروں کو بھی مخلوق الٰہی کے ساتھ حسن سلوک اور رحم و کرم پر ابھارتا ہے۔ "وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ" "اور وہ ایک دوسرے کو رحم و مہربانی اور ہمدردی کی نصیحت کرتے ہیں۔" (البلد)

اور یہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے رحم کے مستحق بن جاتے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "سید القوم خادمھم" "قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے"
(ترمذی، مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ)

اس میں اس بات کی بھی ترغیب ہے کہ جو زیادہ مہربان اور خدمت گار ہو اسے قوم کا سردار بناؤ، تاکہ ملک وقوم کی خدمت کر سکے نیز اس میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ جس شخص کے اندر واقعی اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کی محبت ہوگی تو وہ مخلوق الٰہی پر مہربان بھی ہوگا اور اس کے دل میں خدمت خلق کا جذبہ ہوگا اور ایسا شخص ملک وقوم کا سردار ہوتا ہے۔ اور لوگوں کے دلوں پر ایسا ہی شخص سرداری کرتا ہے۔ اگرچہ بظاہر کرسی پر کوئی اور کیوں نہ بیٹھا

ہو لیکن حقیقت میں یہی شخص قوم کی سیاست وقیادت کا مستحق ہے۔

نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ " لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس "" اس شخص پر اللہ تعالیٰ رحم نہیں کرتا جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا"

(بخاری ومسلم، مشکوۃ باب الشفقۃ والرحمۃ)

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء "" تم زمین پر بسنے والوں پر رحم کرو (ان کے ساتھ اچھا برتاؤ اور نیک سلوک کرو) آسمان والا تم پر رحم کرے گا اور یہی جذبہ ہے جس کی وجہ سے انسان دوسروں کو ایذاء نہیں پہنچا سکتا اور نہ دوسروں کی ایذاء رسانی دیکھ کر برداشت کر سکتا ہے۔

(ابوداؤد، ترمذی، مشکوۃ باب الشفقۃ والرحمۃ)

مومن متواضع اور سخی ہوتا ہے، متکبر اور بخیل نہیں ہوتا

مومن متکبر اور بخیل نہیں ہوتا۔ جو شخص تمام صفات کمال سے متصف صرف ایک اللہ تعالیٰ رب العالمین کو جانتا ہو۔ اسی کو ہر چیز کا خالق ومالک یقین کرتا ہو تو ایسے شخص کے لئے تکبر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ تکبر اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے اور متکبر بخیل بھی ہوتا ہے جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ چل کر اس کی وضاحت آئیگی اس لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ " بخل اور بد خلقی مومن میں جمع نہیں ہو سکتی"

(مشکوۃ باب الانفاق وکراھیۃ الامساک)

ایک مومن جانتا ہے کہ تکبر ہی عظیم شرک ہے۔ کیونکہ متکبر اپنے پاس جو کچھ دیکھتا ہے اسے اپنا سمجھتا ہے یا اسے اپنی عقل ودانش اور اپنی محنت کا نتیجہ سمجھتا ہے، اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر جانتا ہے اور حق داروں کو اپنا حق ادا نہیں کرتا اور جس قدر دیتا ہے، وہ ان پر احسان جتاتا ہے، کیونکہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اسے میں نے اپنی چیز دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متکبر اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ نمائش کی جگہوں میں اور جہاں اس کا نام ہوتا ہے وہاں تو مال خوب اڑاتا ہے اور جہاں نام ونامو س یا کسی دنیاوی نفع کی امید نہ ہو وہاں خرچ کے لئے یہ آمادہ نہیں ہوتا اور مومن کی ذہنیت متکبر حق سے مختلف ہوتی ہے۔

وہ اگر حسین اور توانا ہے تو وہ جانتا ہے کہ حسن اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حسن، توانائی یہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہیں، پھر تو ان پر شاکر ہونا چاہئے اور ان کی قدر کرنی چاہئے۔ ان کو بے جا استعمال کرنے سے سختی سے پرہیز کرنا چاہئے اور تواضع اور عاجزی کرنی چاہئے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کہیں یہ چیزیں اس سے چھین نہ لے۔ تو جو شخص ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقینی طور پر مانتا ہے تو وہ اس سے بھی یقینی طور پر ڈرتا ہے کہ کہیں ناقدری نہ ہو جائے اور ان چیزوں کا غلط استعمال نہ ہو جائے۔ ورنہ ان کا مالک ناراض ہو کر یہ چیزیں مجھ سے آناً فاناً چھین سکتا ہے۔

اسی طرح اگر اس کے پاس کوئی ہنر ہے، مال واولاد ہے یا ملک ومنصب ہے تو وہ اور بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس میں شکر گزاری اور انکساری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے وہ ان چیزوں کو وہاں استعمال کرتا ہے جہاں ان کا صحیح مصرف ہو اور جہاں جہاں اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ یہ عقل، یہ توانائیاں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانتیں ہیں اور مجھے عارضی طور پر دی گئی ہیں۔

مال و دولت جن چیزوں سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اور جن اسباب، علم و عقل اور ہنر و محنت اور قابلیت سے اسے حاصل کرتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کمائی اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں جن سے میں عمل کرتا ہوں آنکھ، کان، زبان دی ہے۔ جس سے میں دیکھنے، سننے، بولنے کا کام لیتا ہوں اور اس نے دماغ دیا ہے۔ جس سے میں سوچتا ہوں اور منصوبہ بناتا ہوں اور یہی نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسی دنیا میں رکھا جو پوری طرح میرے تابع ہے اور اس کی چیزوں کو ایسا بنایا کہ میں ان سے قسم قسم کی چیزیں بناتا ہوں۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دل و دماغ کے ہوتے ہوئے بھی دنیا سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ مثلاً زمین فصل اگاتی ہے، پھولوں کو اگاتی ہے۔ اگر وہ نہ اگاتی تو محنت کا فائدہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص جس کی سوچ اس طرح کی ہو وہ تو اپنی کمائی ہوئی مال و دولت وغیرہ جیسی نعمتوں کو لازماً وہاں خرچ کرے گا جہاں اس کا خالق اور مالک راضی ہوتا کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ تواضع و

انکساری اور سخاوت کے جذبات ابھاریں اور اس کے برعکس جو ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل کی بجائے اپنے ہنر اپنی عقل اور صرف اپنی قابلیت اور محنت کا نتیجہ جانتا ہے تو ایسے شخص کے اندر ضرور بالضرور غرور و تکبر اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جبن اور حقوق کی ادئیگی میں بخل کے جذبات ابھر کر سامنے آئیں گے۔ جب وہ کمائی اور کمال کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے تو وہ لازماً اس پر فخر و تکبر کرے گا اور دوسروں کو اپنے سے نیچے سمجھے گا۔ پہلے تو کسی کو دے گا ہی نہیں اگر دے گا تو مفاد کی خاطر اور احسان جتلا کر دے گا۔ ایسا شخص ہزار بار زبان سے اللہ تعالیٰ کے فضل کے گیت گائے اور اپنے محلات پر لکھا کرے کہ

"هٰذَا مِن فَضْلِ رَبِّي" لیکن اس کے دل کی پکار یہی ہوتی ہے کہ یہ کمال میرا ہی ہے۔ اس لئے اسے اس کے زوال کا خطرہ بھی نہیں رہتا اور سمجھتا ہے کہ یہ میری عقل، ہنر اور قابلیت کا نتیجہ ہے اور یہ ایک مستقل اور عظیم شرک ہے۔ جس میں قارون مبتلا تھا اور وہ یہی کہا کرتا تھا۔

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي

"یہ سب کچھ مجھ کو اس علم (لیاقت) کی وجہ سے ملا ہے جو مجھ کو حاصل ہے" (قصص۔ آیت:۷۸)

لیکن جب دنیا میں ہی اس سے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں چھنی جاتی ہیں۔ تو پھر وہ افسوس کی ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور سورہ کہف میں دو باغ والے شخص کی طرح دنیا ہی میں کف افسوس ملتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے۔

يَٰلَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا

"ہائے اے کاش میں شریک نہ کرتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو" (سورہ کہف۔ آیت:۴۲)

اس دو باغ والے بیچارے کا شرک یہی تھا کہ وہ ساری کارفرمائیوں کو اسباب ہی کی طرف منسوب کرتا تھا۔ ایسے مشرکین اللہ تعالیٰ اور اس کی وحدانیت کا انکار نہیں کرتے مگر دنیا کے کاروبار اور معاملات میں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے ارادے کا خیال نہیں لاتے یا اگر لاتے بھی ہیں تو وہ صرف سرسری ہوتا ہے۔ ورنہ وہ تمام خوشیوں اور کامیابیوں کا

سرچشمہ انہی اسباب ہی کو سمجھتے ہیں۔اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان کے اندر فخر و غرور کی نفسیات ابھر آتی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے منکر اور ناشکرے بن جاتے ہیں، اور اس کے برعکس ایک ایمان والا تمام اسباب و وسائل اور اس کی فراوانی کو محض اللہ کا احسان و انعام سمجھتا ہے۔اس لئے اس کے اندر شکر گزاری اور تواضع و انکساری کا جذبہ ابھرتا جاتا ہے یہ جذبہ اسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ جس طرح اس پر اللہ تعالیٰ نے احسان و انعام فرمایا تو اسی اللہ تعالیٰ کے کہنے اور حکم کے مطابق دوسروں پر احسان کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے اوپر مزید انعامات و احسانات کے دروازوں کے کھل جانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس کے برعکس ناشکرا انانیت کے شرک عظیم میں مبتلا ہو کر لوگوں کے حقوق کا غاصب، متکبر اور حقوق کی ادائیگی میں تنگ دل ہوتا ہے اور اپنے اس غلط جذبے اور عمل سے اپنے آپ کو دنیا و آخرت کے لحاظ سے تباہ و برباد کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور ماں باپ اور لوگوں کے ساتھ احسان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ۝ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا

"یعنی (جو لوگ مذکورہ بالا تعلیم و ہدایت کو نظر انداز کرتے ہیں وہ اس لئے کہ ان میں فخر و غرور کے جذبات ابھر آئیں اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کو جو مغرور ہو فخر کرنے والا ہو یہ وہ لوگ ہیں جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی اپنے عمل سے اپنے قول سے حقوق کی ادائیگی میں) بخل کا حکم دیتے ہیں (تا کہ اس کے بخل پر پردہ پڑا رہے) اور وہ (دور دراز کی باتوں اور اخراجات کو سامنے لاکر) اس نعمت کو چھپاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے (اور یہ لوگ ناشکرے ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے (ایسے) کافروں (یعنی ناشکروں) کے لئے ذلیل کن عذاب تیار کر رکھا ہے" (النساء۔ آیت ۳۶:۳۷ تا ۳۷)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

" **لا یدخل النار احد فی قلبه مثقال حبة من خردل من الایمان و لا یدخل الجنة احد فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر** "

"وہ شخص آگ میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو اور وہ شخص جنت داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر تکبر ہو"

(مسلم، مشکوۃ باب الغضب والکبر)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان اور کبر ایک دل میں جمع نہیں ہوتے نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

" **ان الله اوحیٰ الیّ ان تو اضعوا حتی لا یفخر احد علی احد ولا یبغی احد علی احد** "

"بیشک اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم تواضع اختیار کرو حتیٰ کہ کوئی شخص کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی شخص کسی پر ظلم نہ کرے۔" (مسلم، مشکوۃ باب المفاخرۃ)

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" **مانقصت صدقة من مال و ما زاد الله عبداً بعفو الا عزاً وما تواضع احد لله الا رفعه الله** "

مطلب یہ ہے کہ صدقہ مال کو کم نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ بندے کو اس کے معاف کر دینے کی وجہ سے اس کی عزت کو بڑھاتا ہے (یعنی جو بندہ باوجود قدرت پا جانے کے کسی کو معاف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کی عزت کو بڑھاتا ہے)

اور آدمی (جب) اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کے لئے تواضع اور انکساری اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے (اور اس کے درجات کو) بلند کرتا ہے

(مسلم، مشکوۃ باب الصدقہ)

تواضع اور ذلت میں فرق

یہاں اس بات کو یاد رکھیں کہ تواضع اور ذلت وچاپلوسی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا

ہے۔ کیونکہ تواضع اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت وپہچان اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت اور اپنے نفس کے عیوب اور کمزوریوں پر علم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور حیاء وشرمساری سے جھکا ہوا ہوگا اور اسی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے بارے میں رحم وانکساری سے کام لے گا اور چاپلوسی اور ذلت نفس یہ ہے کہ اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اپنی عزت نفس کو ختم کر کے اختیار کی جائے۔ اور تواضع کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی رضا کی خاطر دوسروں کے مقابلے میں خود کو پست کر کے مخلوق خدا کی خدمت کی جائے ان پر رحم کیا جائے یا یوں کہئے کہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دے کر ان کی خدمت اور ان کا احترام کیا جائے اور ذلت نفس اور چاپلوسی اس کے بالکل برعکس ہے کہ وہ اپنے نفس مثلاً مال وجاہ یا منصب کے حصول یا کسی دنیاوی مفاد اور لذت کے حصول کی خاطر دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کرے اور ظاہر ہے کہ دونوں کے اصل اور ان دونوں کے نتائج میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اس لئے تواضع بہت فضیلت کی چیز ہے اور ذلت نفس و چاپلوسی وغیرہ کا شمار برے رذائل میں ہوتا ہے۔

مومن متواضع کیوں ہوتا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے بہت مال ودولت دیا ہے یا بہت اچھا علم دیا ہے بہت اچھی قابلیت اور ذہانت دی ہے تو آخر ان چیزوں کے ہوتے ہوئے وہ متواضع کیسے ہوسکتا ہے؟ جبکہ وہ خود دیکھتا ہے کہ یہ چیزیں مجھے دوسروں سے زیادہ ملی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مومن اپنے آپ کو یعنی اپنی خداداد صلاحیتوں اور مال ودولت کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھتا ہے اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ ان چیزوں میں میرا امتحان ہے اور پھر اس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت اس قدر چھائی رہتی ہے کہ اسے ذرا ذرا سی کوتاہیاں بہت بڑی کوتاہیاں نظر آتی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ جو چیزیں اس کے پاس اچھی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں اور جس کے پاس جس قدر زیادہ اسباب عزت وراحت ہوں گے۔ وہ اسی قدر زیادہ مقروض ہے پھر اس پر مزید یہ کہ وہ اس میں امتحان سے بھی باخبر ہے اور اس

کے ساتھ اس کی نظر اپنی کوتاہیوں پر بھی ہوتی ہے تو جو ان حقائق سے آگاہ ہو تو اس کا دل و جان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزاری سے جھکے گا۔ وہ اس بات سے لرزے گا کہ کہیں ناشکری نہ ہو جائے کسی کی ناقدری نہ ہو جائے اس لئے ایسا شخص ضرور اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع وانکساری اختیار کرے گا اور اس کے برعکس جو صرف اپنی دنیوی ضروریات جانتا ہے اور اپنی خواہشات کا بندہ ہے تو وہ اس کے حصول کے لئے ہر حربہ اختیار کرے گا۔ وہ ان کے حصول میں اپنی خودی کو اور اپنی عزت کو خاک میں ملائے گا اور اپنی انسانیت کے جوہر کو ختم کرے گا وہ ایک بے ضمیر، بے روح اور بے جان ایمان کا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ بہر حال متواضع شخص فقیروں، کمزوروں، خادموں ہر کسی کے ساتھ متواضعانہ اور انکساری کا رویہ رکھتا ہے ان کے حال اور ضروریات کے مطابق جائز خدمت کرتا ہے۔ اس کے رویے سے فقیروں، مسکینوں، محتاجوں، بے کسوں کا حوصلہ بڑھتا ہے اس لئے یہ لوگ اپنے آپ کو پھر مخلوق کا بے کس، مجبور غلام نہیں کہتے بلکہ اس کے ساتھ رہ کر خادم، فقیر، نوکر وغیرہ زندہ دل خود دار اور دل کے بادشاہ اور غنی مسلمان بن جاتے ہیں نیز اللہ تعالیٰ کی طرف جو چیزیں منسوب ہیں۔ ان کی وہ مقررہ حدود کے اندر احترام وتعظیم کرتا ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ سے سرکشی اختیار کرتے ہیں اور جو مال و دولت کے نشے میں مست ہوں اور فخر وغرور کے مرتکب ہوں ان کے سامنے عاجزی وانکساری کرنا ان کے غرور وتکبر کو اور بڑھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن متکبر اور مغرور سے مستغنی رہتا ہے۔ وہ اس کے سامنے عاجزی وانکساری کے بجائے اس کے ساتھ ایسا رویہ رکھتا ہے کہ اس سے غرور وتکبر کا نشہ کافور ہو جائے۔ اور اس کے برعکس چاپلوس اور ذلیل وہ ہوتا ہے جو مغروروں، متکبروں کی خوشامد کرتا ہے اور دنیا داروں کا احترام کرتا ہے اس کے سامنے ایسا رویہ اختیار کرتا ہے کہ جس سے اس کی خودی اور عزت نفس پامال ہو جاتی ہے۔ بعض غیر متواضع شخص کو دیکھا جاتا ہے کہ اللہ والوں کا بھی بھی احترام کرتا ہے۔ وہ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کم سمجھتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ بزرگ اس کو کسی دینی یا دنیوی منصب پر بٹھا کر محترم شخصیت بنا دے۔ ایسا شخص فقیروں، کمزوروں، مجبوروں کے سامنے اتراتا ہے۔ فقیروں کی ملاقات سے بوجھ محسوس کرتا ہے اور

دولت وثروت میں مست لوگوں کی خاطر و مدارت اور احترام کرتا ہے۔ وہ اگر کبھی فقیر، مسکین کا بھی احترام کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس سے کم سمجھتا ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اسے اپنی پارٹی میں یا مداحوں میں شامل کر کے اپنی عزت و جاہ کو بڑھائے۔ تو یہ شخص متواضع نہیں بلکہ متکبر اور ریاء کار ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ رہنے والے کے اندر غلامی اور بے بسی کا احساس بڑھتا ہے نیز اس کے اندر یہی کمینی خسیس صفات پیدا ہونے لگتی ہیں کہ فقیروں محتاجوں اور بے کسوں کو غلام بنائے اور جہاں مال و جاہ کا حصول ہو۔ وہاں چاپلوسی اور ذلت کا مرتکب ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ متواضع وہ ہوتا ہے جس سے تواضع اور انکساری ٹپکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکساری کرنے والا اور متواضع شخص انسانیت کو نفع اور فائدہ پہنچاتا ہے وہ انسانیت کی خدمت کرتا ہے اور چاپلوس، ذلیل یا ریاء کار، نام نہاد متواضع سے انسانیت کو فائدہ اور خدمت کی بجائے کو ضرر اور نقصان پہنچتا ہے۔

مومن صابر اور شاکر ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان انسان کے اندر صبر اور شکر پیدا کرتا ہے وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بوجھ تلے اپنے آپ کو محسوس کر کے اس کی نعمتوں کا قدر دان رہتا ہے۔ دوسری طرف آخرت کے مقابلے میں وہ دنیا کے آرام و راحت، مال و دولت اور درد و غم کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا۔ یہ ساری چیزیں آخرت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے مقابلہ میں انھیں حقیر ترین معلوم ہوتی ہیں نیز یہ کہ وہ ہر مصیبت اور مشقت کے بارے میں یہی سمجھتا ہے کہ یہ کسی اندھی بہری طاقت کی طرف سے یوں بے سوچے سمجھے نازل ہونی والی مصیبت نہیں۔ بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ حکیم ذات کے فیصلے اور قضا کے مطابق ہے۔ اس کا ہر فعل علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے ہر فعل میں مخلوق کے لئے رحمت و شفقت پوشیدہ رہتی ہے اور اس کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ انھی مصیبتوں سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے اور حق پر برابر جمنے سے اس کے اندرونی جوہر کھلتے ہیں۔ نیز یہی مشکلات و مصائب اس کے لئے قیمتی اسباق بن کر اس کی تربیت کرتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا شخص مصائب سے گھبرائے گا اور نہ کسی وقت حق سے متزلزل ہوگا۔ وہ اگر گھبراتا ہے تو صرف اس بات سے کہ یا اللہ کہیں میں اس امتحان و آزمائش میں ناکام نہ ہو جاؤں۔ وہ ہر حال اور ہر مشکل میں حق پر ثابت قدم رہے گا اور یہی صبر ہے اور یہی وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ہمہ وقت قدردان رہتا ہے اور ہر وقت اس کی نعمتوں کا شکریہ دل وزبان اور عمل سے ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی میں ڈوبا رہتا ہے یہی لوگ ہوتے ہیں جن کی دنیا و آخرت سلامتی، راحت و اطمینان اور خوشگواری کیساتھ گذرتی ہے اور اس کے برعکس غیر مومن ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ اس کی زندگی چڑیا کے پر کی طرح ہوتی ہے کہ ہوا کے ساتھ اڑتی پھرتی ہے۔ جس طرف دنیا کا مفاد ہو، اس طرف دوڑتا پھرتا ہے ہر وقت اندر سے پریشان، غم وحزن وخوف میں مبتلا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدردانی کی بجائے اس کی ناشکری اور ناقدری کر کے، دنیا و آخرت کو تباہ و برباد کرتا ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ

"بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔" (زمر۔ آیت:۱۰)

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

"یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں (اور ہر حال میں حق پر جمنے والوں) کے ساتھ ہے" (بقرہ۔ آیت:۱۵۳)

وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ

"اللہ تعالیٰ صابروں (حق پر ثابت قدم رہنے والوں) کو محبوب رکھتا ہے" (آل عمران۔ آیت:۱۴۶)

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ

"پھر وہ ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی اور مہربانی و ہمدردی کی نصیحت کرتے ہیں یہی لوگ "اصحاب المیمنہ" (ہر قسم کی برکات کو پانے والے) ہیں" (البلد۔ آیت: ۱۷،۱۸)

شکر کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

"اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا ہے اور تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس لئے تمہارے لئے کان اور آنکھ اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو۔" (نحل۔ آیت: ۷۸)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِـيْمًا

"اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزاری کرو (اور ان کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کر کے ٹھیک ٹھیک کام میں لاؤ) اور ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا ہے" (النساء۔ آیت: ۱۴۷)

مومن کے عام فیصلے عدل پر مبنی ہوتے ہیں

مومن سچا اور عادل ہوتا ہے اس کی پوری زندگی اور اس کے تمام فیصلے عدل و قسط پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ کبھی خائن کا طرف دار نہیں ہو سکتا۔ اس کے پاس جو کوئی اپنا فیصلہ لے جاتا ہے تو لوگوں کو اس پر مکمل اعتماد ہوتا ہے۔ وہ کسی کی طرف داری نہیں کرتا۔ کیونکہ اسی سچائی اور سچائی کی طلب کی وجہ سے تو اس نے سچائی و عدل و قسط پر مبنی "دین اسلام" کو قبول کیا ہے اور دین اسلام کے تمام احکامات، ہدایات، ترغیبات اس کی سچائی اور عدل کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ جو اسے افراط و تفریط کی زندگی سے بچاتے ہیں لہٰذا وہ اپنے تمام تر معاملات میں عدل کرتا ہے۔

خواہ بھائیوں میں ہو، اولاد کے درمیان ہو، اپنی بیویوں کے درمیان ہو، ناپ تول

ہو، لین دین ہو، غرض یہ کہ اس کی ہر چیز میں سے عدل اور عدل کا نور نظر آئے گا اور اس سے عدل کی روشنی پھیلے گی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مومن اللہ تعالیٰ اور حق کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھنے والا ہے تو پھر ایسے عاشق حق اور بندہ حق تعالیٰ شانہ، سے کس طرح یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب، مسلک، یا رشتہ داری یا دوستی وغیرہ جیسے تعلقات اور جذبات کی بناء پر حق اور عدل کے خلاف فیصلہ کر سکے، اس کے سامنے اگر دشمن کا فیصلہ بھی آ جائے گا تو وہ اس کو پورا پورا انصاف فراہم کرے گا۔

اسی طرح اگر وہ کسی کے ساتھ اختلاف رکھتا ہو تو وہ اس میں حدود سے تجاوز نہیں کرے گا، حتیٰ کہ وہ غصے کی حالت میں بھی عدل سے ہٹی ہوئی بات جیسے گالی گلوچ وغیرہ سے اپنی زبان کو بچائے رکھتا ہے۔ کیونکہ گالی ایک ایسا جھوٹ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اپنے مخالف کو غصہ دلانا یا بدنام کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے باطن اور ظاہر میں پوری طرح یکسانیت ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ، نیت کچھ اور عمل کچھ، جب وہ اچھے کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے پوری سچائی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ جھوٹ، غیبت، چغلی سے سخت پرہیز کرتا ہے اور اس کے تمام تر معاملات عدل و سچائی بلکہ رحم و احسان پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی صفت عدل و صدق اور رحم وغیرہ کی صفات کے جو سائے پڑتے ہیں تو یہ مومن اپنے اعتدالی مزاج کے مطابق اسے اچھی طرح قبول کرتا ہے اور یہی عدل و سچائی، رحم وغیرہ کی صفات کی خوشبو اس سے مہکتی ہے۔

وہ ظلم سے اس قدر دور ہوتا ہے کہ اگر موذی جانور کو بھی مارتا ہے تو وہ اسے تکلیف دے کر مارنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ انسان تو کیا اگر وہ جانور سے بھی کوئی کام لیتا ہے تو اس وقت بھی وہ عدل و رحم کے تمام آداب کا خوب لحاظ رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اگر کوئی انسان اس کا خادم اور نوکر ہو تو وہ تو اس کا اس قدر احترام کرتا ہے کہ باہر سے دیکھنے والا اسے اس کا بیٹا یا بھائی سمجھتا ہے نہ کہ خادم اور نوکر۔

اگر اسے کوئی اقتدار مل جاتا ہے تو وہ اپنے ماتحتوں اور رعایا کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہے ایسا ہرگز نہیں کرتا کہ وہ خود تو کھائے پیئے اور اس کی رعایا بھوکی رہے وہ تو وہی کھاتا ہے

یا پہنتا ہے جو عام رعایا یا اس کے ماتحتوں کو ملتا ہے۔ بلکہ وہ خود بھوکا ہو کر رعایا اور ماتحتوں کو کھلاتا ہے، پہناتا ہے اور ان کے ہر قسم کے آرام و راحت اور تعلیم و تربیت کا انتظام کرتا ہے۔ جیسا کہ اس پر خود نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی اور آپ ﷺ کے تمام صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کی زندگی شاہد ہے۔ آخر مومن کس طرح عدل و قسط اور سچائی سے ہٹا ہوا کام یا کوئی فیصلہ یا بات کرے گا جبکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ واضح حکم موجود ہو۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ

"بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا۔" (نحل۔ آیت: ۹۰)

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ

"اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو"

(سورۃ النساء آیت: ۵۸)

نیز ارشاد فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى

"اے ایمان والو اللہ تعالیٰ (کی سچائی اور اس کی باتوں اور حکموں) کے لئے خوب قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو اور (دیکھو) کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس بات پر نہ ابھارے کہ تم (اس دشمن سے) انصاف نہ کرو (بہر حال) انصاف کرو یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔" (سورہ مائدہ۔ آیت: ۸)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ

"اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے" (مائدہ۔ آیت: ۴۲)

خلاصہ یہ کہ مومن کی فکر، سوچ اور اعمال و اقوال میں عدل اور اعتدال ہوتا ہے۔ اس

کی باتیں اس کے فیصلے اس کا کردار صحیح توازن وتناسب کے ساتھ بچا تلا ہوتا ہے۔ وہ نہ خود ظلم کرتا ہے نہ کسی ظالم کی ذرہ برابر حمایت کرتا ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ

''اور نہ جھکو ان کی طرف جنھوں نے ظلم کیا ورنہ تم کو (بھی) آگ پکڑ لے گی'' (ھود۔ آیت: ۱۱۳)

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ

'' من مشی مع ظالم لیقویه وهو یعلم انه ظالم ، فقد خرج من الاسلام .''

''جو شخص کسی ظالم کے ساتھ چلا جائے تا کہ اس کی (حمایت کر کے اس باطل بات یا کام کو) تقویت پہنچائے اور وہ (اس بات کو) جانتا ہے (کہ جس کی وہ حمایت اور مدد کرتا ہے) وہ (ناحق اور باطل پر اور) ظالم ہے تو وہ شخص (یعنی حمایت اور مدد کرنے والا) اسلام سے نکل گیا۔'' (بیہقی، مشکوۃ باب الظلم)

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کے ظلم وزیادتی سے اور ہر قسم کے ظالموں کی تائید واعانت سے حفاظت میں رکھے اور ہماری پوری زندگی کو ایمان، عدل وانصاف اور رحم وامانت داری وغیرہ اسلامی صفات اور اس کے اصولوں پر چلائے رکھے۔ (آمین)

مومن راہ خدا میں اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے

ایک مومن چند وجوہات کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر قسم کی جدوجہد کو اختیار کر لیتا ہے۔

۱۔ انسان کو جس چیز سے محبت ہو اس کے حصول کے لئے وہ لازماً جدوجہد کرتا ہے۔ تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے سخت محبت ہو گی تو لازماً اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے دین کو اپنے اندر لانے اور دوسروں میں لانے اور اسے دنیا میں غالب کرنے کی محبت اور تڑپ بھی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی محبت اسے چین سے نہیں بیٹھنے دے گی کہ وہ دنیا میں موجود ہے اور پھر بھی لوگ اللہ تعالیٰ کی بجائے دوسرے باطل دین کو اپنائے ہوئے ہیں۔

۲۔ مومن اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرنے والا ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے حکم جہاد اور مجاہدہ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے کا سن کر فوراً اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال وجان سے جدوجہد کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

۳۔ مومن کے اندر جذبہ رحم بڑے پیمانے پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ ہر انسان کا ہمدرد ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح دنیا وآخرت کے مصائب اور ذلت ورسوائی سے بچ جائے اور یہی رحم کا جذبہ اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر لگا دیتا ہے۔ جس کے ضمن میں وہ تمام جدوجہد آجاتی ہیں جو کسی پر رحم کرنے کے ضمن میں آتی ہیں۔ مثلاً ظالموں کے ہاتھ کو روکنا، بے بسوں، اور مجبوروں، مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے رہائی دلوانا۔ ڈاکوؤں، چوروں اور خائن لوگوں کے ظلم وخیانت کو ختم کرنا اور جو لوگ شیطان کے بھائی بن کر کمزوروں پر مصائب ڈھاتے ہیں اور ان کا مال بے جا ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اور اسی طرح ہر باطل اور ظالم کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے ورنہ بالآخر اس ناسور کو انسان کے جسم سے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا صفایا کر کے باقی انسانیت کو اس سے چھٹکارا دلوانے کی کوشش کرتا ہے اور رحم وعدل اور باہمی ہمدردی اور بھائی چارے کے فطری نظام اور حق کے قانون یعنی قانونِ اسلام کو نافذ کرتا ہے جو دنیا کو امن وسکون کی ضمانت دیتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کے کردار کو بیان کر کے فرماتا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

"مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر وہ کسی شک میں مبتلا نہ ہوئے اور (اس کا عملی ثبوت یہ دیا کہ) انہوں نے اپنی جان سے اللہ تعالیٰ

کے راستے میں جہاد کیا، یہی لوگ (ایمان میں) سچے ہیں۔" (حجرات۔آیت:۱۵)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۚ

"جو لوگ ایمان لائے ہیں (انکا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ) وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے ہیں (وہ کبھی انانیت اور دنیا پرستی کے تحت نہیں لڑتے) اور جو منکرینِ حق ہیں وہ طاغوت (یعنی سرکش اور قانونِ حق اور رحم وعدل کے قانون سے تجاوز کرنے والے شر وفساد کی سرکش طاقتوں) کی راہ میں لڑتے ہیں۔پس تم (حق کی خاطر اللہ تعالیٰ کی راہ میں) شیطان کے ساتھیوں سے لڑو۔بے شک شیطان کی چال بہت کمزور ہے (اور وہ حق کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا)" (نساء۔آیت:۷۶)

اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے خرید لیا، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پھر (کافروں اور ظالموں کو) مارتے ہیں اور (خود بھی جنگوں میں) مارے جاتے ہیں۔" (توبہ۔آیت:۱۱۱)

مومن صرف اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتا ہے

مومن اپنی تمام زندگی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون اور دین پر اعتماد وبھروسہ اور توکل کرتا ہے کیونکہ مومن جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ذات بھی ہے اور مختارِ کل رحیم وکریم بھی اور ہر ہر چیز پر قادر مسبب الاسباب اور کارساز بھی ہے، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی بات، تعلیم اور وعدہ پر کامل اعتماد رکھتا ہے اور اسے یہ بات خوب معلوم ہوتی ہے کہ نفع اور سراسر کامیابی اللہ تعالیٰ کی بات ماننے اس کے حکم اور بتائے ہوئے پرہیز میں ہے یہی وجہ ہے کہ ایک مومن کبھی کسی ایسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت

کے خلاف ہو، وہ یکسو ہو کر صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی باتوں پر عمل کرتا ہے اور اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے کہ اسی میں دنیا و آخرت کی کامیابی اور اس کے خلاف کرنا سراسر نقصان، تباہی اور ہلاکت کا سبب ہے، چونکہ وہ نفع، نقصان کا مالک ومختار صرف اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی تمام مشکلات اور ضروریات میں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے ذلت کے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور نہ وہ دل کا ہاتھ غیروں کی طرف بڑھا کر طمع کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسے جس طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایات پر اعتماد ہوتا ہے کہ اس سے خوشگوار نتائج ضرور نکلیں گے۔ اسی طرح اس پر بھی کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ وہی مشکل کشا اور حاجت روا ہے۔ اور اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جو نفع ونقصان کی مالک ہو، یہی وجہ ہے کہ جب اس کے ساتھ اسباب نہ ہوں پھر بھی وہ اسی طرح مطمئن رہتا ہے جس طرح اسباب کی موجودگی میں۔ کیونکہ اسے خوب معلوم ہوتا ہے کہ اسباب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اس کی پیدا کردہ ہیں اس لئے اسباب موجود ہوں یا نہ ہوں بہر حال اس کا اعتماد صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی بتائی ہوئی تعلیم پر ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مومن کسی سے قرض مانگتا ہے یا کسی حاکم سے کوئی کام بھی کروانا چاہتا ہے تو اسے اس شخص اور حاکم پر اعتماد نہیں ہوتا بلکہ پہلے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے کہ یا اللہ تو ہی اس کے دل میں ڈال دے کہ وہ عزت کے ساتھ میرا یہ کام کردے اور جب وہ اس کا کام کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرکے اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لئے سبب بنایا اور اسباب کی قدردانی بھی ضروری ہے۔ نیز جب وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اسے خوب معلوم ہوتا ہے کہ شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لئے وہ پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی یا اپنے عیال کی بیماری سے شفا کی لجاجت سے دعا کرتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی معلوم ہے کہ

اللہ تعالیٰ مہربانی اسی پر کرتا ہے کہ جس کے دل میں مہربانی کے لئے کوئی جگہ تو ہو تو اس لئے طبیب اور ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نام پر کچھ صدقہ کرکے فقیر ومسکین پر مہربانی کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے مقررہ اسباب دوا کو استعمال کرکے

صرف اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہے کہ وہ مجھے تندرست کرے گا۔ وہ کفر اور باطل کے مقابلے میں جنگی تیاری کرتا ہے۔ لیکن اس کا اعتماد اپنی تیاریوں پر نہیں اور نہ کثرت فوج وسامان پر ہوتا ہے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ اسباب کو استعمال کر کے اس کا اعتماد اور بھروسہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اسباب کے حصول اور ان کے استعمال میں بھی اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کی تعلیم وہدایات کی خلاف ورزی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی باتوں پر اعتماد نہیں کرتا اور اسباب کے حصول میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو نظر انداز کرتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس کا اعتماد اور بھروسہ اللہ تعالیٰ پر نہیں بلکہ اسباب پر ہے۔ نیز جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کے خلاف دوسروں کی اطاعت کرتا ہے۔ پھر بھی اپنے آپ کو مومن کہتا ہے تو یہ اپنے ایمان میں جھوٹا ہے۔ کیونکہ ایمان کے ساتھ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

"اور اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو" (آل عمران۔ آیت:۱۶۰)

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

"اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو" (مائدہ۔ آیت:۱۱)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

"اور اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو" (مائدہ۔ آیت:۲۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ:

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ

"اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو اگر تم واقعی مسلمان

(اور فرمانبردار) ہو۔ "(یونس۔ آیت:۸۴)

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے بجائے اسباب پر اعتماد کرتا ہے اور ان کو حاصل کرنے میں مسلسل اللہ تعالیٰ کے حکم کو نظر انداز کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں اپنی عقل پر بھروسہ کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے بجائے صرف اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرتا ہے، تو اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان کیسے معتبر مانا جائے۔ ایسی صورت میں اگرچہ وہ زبان سے توحید وایمان ویقین اور اللہ تعالیٰ پر توکل کے دعوے کرے۔ لیکن یہ جھوٹے دعوے کے سوا اور کیا ہے؟ ایسا شخص تو اپنے نفس کی بندگی کرے گا، اسباب کی بندگی کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے حوالے ہونے کے بجائے اپنے نفس اور اسباب کے حوالے ہوگا۔

مومن متقی ہوتا ہے اور وہ محتاط زندگی گذارتا ہے

مومن اپنی پوری زندگی سخت احتیاط سے بسر کرتا ہے تاکہ کہیں حق سے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ذرہ برابر قدم ہٹنے نہ پائے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ مومن کو یہ حقیقت خوب معلوم ہوتی ہے کہ نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نفع وفائدہ صرف اسی کے قانون اور اس کی ہدایت کے مطابق چلنے میں ہے اور اس کے خلاف چلنے میں سراسر نقصان ہے اگرچہ عارضی اور ظاہری طور پر فائدہ نظر آئے۔ لیکن اس کا نتیجہ نقصان وخسران ہی ہوگا۔

تو ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اسے نفع کی امید صرف اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق چلنے میں ہوگی اور اس کے قانون کے خلاف چلنے سے لرزاں رہے گا۔
دوسری یہ کہ مومن کو اللہ تعالیٰ سے سخت محبت ہوا کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انسان کے اوپر جس شخص کی سخت محبت اور عظمت چھائی ہوئی ہوتی ہے تو وہ اس کے معاملہ میں سخت محتاط رہتا ہے، اسے وہ نہ بھول سکتا ہے اور نہ اس کی کسی بات اور حکم یا جس چیز سے اس نے منع کیا ہے بھول سکتا ہے۔ وہ اس کے معاملہ میں پھونک پھونک کر

قدم رکھتا ہے اور اس کی رضا، خوشنودی حاصل کرنا اس کا واحد مقصد بن جاتا ہے اور عشق و محبت اور عظمت جس قدر بڑھے گی احتیاط اس قدر بڑھے گی، گویا اسی کو تقویٰ سمجھیں اور محتاط کو متقی[1] اور یہ بات تو بتا چکا ہوں کہ مومن کو حق سے اور حق تعالیٰ شانہ سے سخت محبت ہوا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اس کے دل پر چھائی رہتی ہے۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے معاملہ میں سخت محتاط رہتا ہے کہ کوئی قدم حق سے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی سے ہٹنے نہ پائے۔ کوئی ایسا کام اور بات نہ ہو جائے جس کی وجہ سے میرا پروردگار ناراض ہو جائے۔ اس لئے وہ دنیا کے اس جنگل اور جھاڑیوں سے جب گذرتا ہے تو صرف ڈرتا نہیں بلکہ احتیاط کے ساتھ جاتا ہے۔ دامن اور کپڑوں کو سمیٹ کر اور بچا بچا کر قدم رکھتا ہے اور جس شخص کے دل پر جس قدر محبت الٰہی اور عظمت الٰہی چھا جاتی ہے اور جس قدر اسے اس بات پر یقین ہو کہ نفع و نقصان کا مالک صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے تو وہ اپنی پوری زندگی میں اسی قدر محتاط رہے گا۔

وہ اللہ تعالیٰ کی حدود اور احکامات کی پوری نگہداشت کرتا رہے گا۔ وقت کو امانت سمجھ کر اس کا معاملہ محتاط ہوگا کہ کہیں فضول وقت نہ گزرے۔ احکامات یعنی نماز وغیرہ کے بجا لانے میں بھی پوری کوشش کرے گا اور اس میں ہر کوتاہی سے بچے گا اور اس میں نقصان کرنے کے بارے میں سخت محتاط رہے گا۔ انسانوں کے حقوق میں بخل سے کام نہیں لے گا بلکہ اس کے بارے میں وہ سخت محتاط ہوگا اور پوری فراخی اور کشادہ دلی سے حقوق العباد کی ادائیگی کا پورا اہتمام کرے گا اور حقوق کی ادائیگی میں ہر قسم کی خیانت سے احتیاط کرے گا اور اپنی ذات پر بھی جو خرچ کرے گا یا جس چیز کو استعمال کرے گا تو اس میں بھی سخت احتیاط سے کام لے گا۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو مسرف لوگ ناپسند ہیں۔

" إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ "

---

[1] یاد رہے تقویٰ نہ صرف خوف کو کہا جاتا ہے اور نہ بچنے کو بلکہ اردو میں اگر قریبی لفظ سے اسے ادا کرنا چاہو تو وہ احتیاط ہے کیونکہ احتیاط خوف اور بچاؤ دونوں چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے محتاط کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ڈر کر بچتا رہتا ہے۔

"بیشک اللہ تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں کرتا۔"

تا کہ کسی طرح اس میں اسراف نہ ہو جائے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قدر اسراف ہوگا اسی قدر دوسروں کے حقوق مارے جائیں گے (خیانت کا مرتکب ہوگا) اس لئے وہ اپنے کمائے ہوئے مال اور صلاحیتوں کو قطعاً فضول اور بے جا استعمال نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے کمانے اور خرچ کرنے میں بھی سخت محتاط رہتا ہے تا کہ ذرہ برابر حرام کی کمائی کا مرتکب نہ ہو۔ اس لئے وہ اس کمائی اور اس مال و طعام سے بھی گریز کرتا ہے جس میں حرام ہونے کا شبہ ہو۔ وہ اپنی زبان کے معاملہ میں بھی محتاط ہوگا۔ وہ فضول گوئی، غیبت، جھوٹ اور کسی پر بہتان باندھنے سے پرہیز کرے گا۔ حتیٰ کہ بلا تحقیق کسی بھی بات کو نہیں پھیلائے گا۔ کیونکہ یہ محتاط انسان سمجھتا ہے کہ بلا تحقیق ہر بات کی تشہیر بھی انسان کو جھوٹا بنانے کے لئے کافی ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے۔

" کفی با لمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع "

"آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے کہ جس بات کو سنے اس کو (بلا تحقیق) بیان کرے۔" (مشکوۃ۔ کتاب الاعتصام بحوالہ مسلم)

بس وہ زبان کے معاملہ میں اسی اصول کو اپنائے رکھے گا کہ اس سے کوئی اچھی اور خیر اور لوگوں کے درمیان کوئی اصلاح کی بات نکلے۔ ورنہ چپ رہے گا اور اس کے خلاف کرنا اور بے فائدہ باتیں کرنا اسے ایمانی موت معلوم ہوتی ہے۔ مومنوں کی صفات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ

"اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں" (سورہ مومنون۔ آیت:۳)

اور نبی کریم ﷺ نے مومن کی صفت کو بیان کر کے فرمایا ہے۔

" ومن کان یؤمن باللہ و الیوم الاخر فلیقل خیراً او لیصمت "

"اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ خیر کی بات کہے یا خاموش رہے" (بخاری و مسلم)

نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

" لیس المؤمن بالطعان ولا باللعان ولا الفاحش ولا البذی "

'' مومن لوگوں کو طعن کرنے اور لوگوں پر لعنت کرنے والا فحش بکنے والا (بے حیاء) زبان دراز نہیں ہوتا۔ '' (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان)

خلاصہ یہ کہ مومن اپنے تمام اعضاء زبان، دل ودماغ، آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں اور ان کے درمیان چیزوں کے معاملہ میں بہت ہی محتاط رہتا ہے کہ کہیں کسی قدر بھی اس میں خیانت نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانتیں کہیں ذرہ برابر حق وعدل سے ہٹ کر غلط استعمال نہ ہو جائیں۔ یہی معاملہ اپنے سے خارج مخلوق، انسانوں، جانوروں حتٰی کہ درختوں کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ کسی درخت کو بھی بلاضرورت نہیں کاٹتا نہ دنیا کی کسی چیز کو غلط استعمال کرتا ہے اپنی پوری زندگی کو احتیاط کے ساتھ گزار کر مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر آن یہ سمجھتا ہے کہ میں نے پوری احتیاط نہیں کی۔ میں نے پوری بندگی نہیں کی۔ اسے اپنے اوپر نفاق کا خطرہ رہتا ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام اور محتاط اور متقی لوگوں کے واقعات سے ثابت ہے اور تجربہ بھی یہی ہے۔

پرہیزگاری کے بارے میں عوام کا غلط خیال

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ محتاط و متقی سے ہرگز وہ متقی و پرہیزگار مراد نہیں جسے عوام سمجھتے ہیں۔ عوام تو اسے پرہیزگار کہتے ہیں کہ جو مستحبات کا اہتمام کرتا ہے۔ اگرچہ فرائض سے غافل ہوتا ہے یا زندگی میں تھوڑی پرہیزگاری کی چیزوں کو تو اپناتا ہے مثلاً یہ کہ مرغی کا گوشت اس لئے نہیں کھاتا کہ اس نے گندگی کھائی ہے یا کسی کے باڑے کا تنکا لیا اور اس سے دانتوں میں خلال کرتا ہے تو پھر باڑ والے سے پوچھتا ہے اور ایک روپیہ راستے میں پالیتا ہے تو لاؤڈ سپیکروں میں اعلان کراتا ہے اور اگر کوئی یہ احتیاط کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے لرزتا ہے تو یہ واقعی مبارک بات ہے۔ لیکن اگر اس کی زبان غیبت، بہتان سے تر ہے اور یتیموں کا مال یا حق مارتا ہے، زکوٰۃ لینے کا مستحق نہیں پھر بھی حیلے تلاش کر کے غریبوں، مسکینوں کا حق ہڑپ کر لیتا ہے اور فقیر کو دینے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا، صرف

سیر و سیاحت اور فضول خرچیوں کے لئے ہزاروں لاکھوں روپیہ لگانا آسان ہوتا ہے سود کا مال کھاتا ہے۔ کمائی میں حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا۔ عورتوں اور اپنی بہنوں وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کے مقررہ حصوں کے مطابق میراث نہیں دیتا اور نہ ان کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔ تو آخر یہ کس دین، تقویٰ اور کس مذہب کی پرہیزگاری ہے۔ جو مستحبات کے چھوڑنے اور معمولی معمولی چیزوں سے تو ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن بڑے بڑے فرائض اور ذمہ داریوں کے چھوڑنے اور بڑی بڑی حرام چیزوں اور مردار کھانے سے اس پر حرف نہیں آتا۔ یہ تو وہی ریاہ کاروں کا تقویٰ اور احتیاط ہے۔ جس پر حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے سخت تنقید کرتے ہوئے قوم کے علماء و مشائخ کو مخاطب ہو کر یوں فرمایا کہ:

"اے ریاہ کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو عشر دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف و رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے، لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھی راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔" (متی باب ۲۳۔ آیت نمبر ۲۳ تا ۲۴)

غرض یہ کہ مذکورہ بالا رویہ اور کردار تو متقیانہ نہیں۔ بلکہ ریاکارانہ اور منافقانہ ہے اور مومن، متقی اور محتاط وہ ہوتا ہے جس کی پوری زندگی کے تمام تر معاملات، معاشرت، اقتدار و سیاست، خوشحالی اور تنگی، غصہ، کمائی، صلح و جنگ ہر حالت اور ہر موقعہ پر وہ احتیاط کرتا ہے کہ کہیں بھی ذرہ برابر اس کے قدم حق سے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی سے نہ ہٹنے پائیں۔

مومن سے غلطی ہو سکتی ہے لیکن وہ ہٹ دھرمی نہیں کرتا

مومن سے گناہ اور جرم ہو سکتا ہے لیکن وہ بے شرم ہو کر گناہ اور جرم پر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ انسان سے غلطی اس لئے ہو جاتی ہے کہ کبھی کبھی جذبات کا جوش اس کی عقل و ایمان پر غالب آجاتا ہے۔ تو وہ ایسی صورت میں کوئی گناہ کر جاتا ہے۔ مثلاً کبھی غصہ میں کسی کو تھپڑ مار دیا اور کوئی غلط کام کیا۔ لیکن اس کے جذبات سے مغلوبیت وقتی ہوتی ہے۔ جب بھی وہ جذبہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو فوراً اسے غلطی کا احساس ہوتا ہے اور سخت شرمندہ ہوتا ہے۔ جس کی اس نے حق تلفی کی ہے فوراً اس سے معافی مانگتا ہے اور اپنی غلطی کی تلافی

کی انتھک کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے اور آئندہ کے لئے ایسی غلطی سے لرزتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی غلطیاں اسے پہاڑوں جیسے بڑے بڑے جرائم نظر آتی ہیں اور اس کے برعکس بے حیا اور بے ایمان لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان سے غلطی جذبات کے تحت نہیں بلکہ مستقل ذہنیت کے تحت ہوا کرتی ہے۔ اس لئے انھیں گناہ اور جرائم پر شرمندگی نہیں ہوتی اور نہ ان کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ وہ غلطی کی تلافی کریں۔

ایسے لوگ دوسروں کی غلطیوں کو تو جانتے ہیں۔ لیکن اپنے متعلقین اور اپنی پارٹی کے لوگوں کی کوتاہیاں ان سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ حالانکہ انسان کے کام آنے والی چیز یہ ہے کہ انسان اپنی کوتاہیوں کو جانے اور ان کا علاج کرے اور جو شخص اپنی اور اپنی جماعت یا پارٹی اور احباب کی کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے دوسروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو جستجو کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حجت پوری ہو جاتی ہے کہ اسے اتنی سمجھ تو تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کو سمجھ لے مگر اس کی سرکشی اور ہوائے نفس نے اسے اپنی غلطیوں سے اندھا بہرا بنا دیا۔ بہر حال مومن وہ ہے جس کی غلطی جذبات سے مغلوبیت کی بنا پر ہوتی ہے لیکن جذبات کے ٹھنڈے ہوتے ہی وہ معافی اور تلافی کے ساتھ اس غلطی کو دھو کر پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ

"توبہ جس کی قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی میں بری حرکت کرتے ہیں پھر جلدی توبہ کرتے ہیں۔" (نساء آیت: ۱۷)

نیز اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے متعلق فرماتے ہیں۔

وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ

"اور وہ جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے اس پر جو ان سے سرزد ہوا" (آل عمران۔ آیت: ۱۳۵)

مومن کی نماز

مومن کی نماز خشوع وخضوع والی ہوتی ہے۔ کیونکہ مومن کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور وہ اس کی نافرمانی اور ناراضی سے لرزاں وترساں رہتا ہے۔ وہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ پانچ وقت نماز کو فرض جان کر اپنے اوپر اللہ کا احسان مانتا ہے کہ اسے یہ شرف حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اس کے سامنے عاجزی کرکے اور یہ عہد تازہ کرکے کہ صرف اس کی بندگی کروں گا۔ اپنی زندگی کے ارادوں افعال اور اقوال اور معاملات میں اپنے نفس کو اور نہ کسی دوسرے کو شریک کروں گا۔ اسی پر توکل و بھروسہ کرکے صرف اسی سے مانگوں گا۔ سیدھی راہ پر چلنے کے لئے اپنی انتہائی کوشش صرف کروں گا اللہ تعالیٰ سے یہی التجا کرتا ہے کہ کبھی سیدھی راہ سے اور منزل تک پہنچانے والی راہ، انعام یافتہ لوگوں کی راہ سے قصداً پاؤں نہ ہٹنے پائیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق بن جاؤں گا اور بے فکری سے راہ حق سے بھٹک جاؤں کہ حق کی تلاش ہی نہ رہے تو ایسی صورت میں گمراہی کی تاریک راہوں میں بھٹکتا رہوں گا۔ غرض مومن اپنی نماز پوری حفاظت اور اہتمام سے قائم کرتا ہے۔ اس کے ظاہری اور باطنی آداب کا خوب خیال رکھتا ہے۔ وہ اپنی فرض نمازوں کا مسجد میں جماعت کے ساتھ خوب اہتمام کرتا ہے اور اس بات سے خوف زدہ رہتا ہے کہ کہیں میری تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے حکم وقانون میں کسی عام نقصان کا مرتکب نہ ہوں یہی خشوع اور خضوع والی نماز ہے جو اس کے اندر استقامت، سخاوت، تواضع، رحم وغیرہ جیسی عظیم صفات کو بڑھاتی ہے اور اسے جرائم اور گناہوں، بخل، فحش اور بے حیائیوں کے راستوں سے بچانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ مومن، مومن ہو اور اس کی نماز، نماز ہو۔ ورنہ اگر اس نماز سے مذکورہ بالا صفات اس کے اندر پیدا نہ ہوں تو سمجھو کہ ایمان میں کھوٹ ہے اور نماز جعلی اور نمائشی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ

”یقیناً فلاح پائی ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے اور صرف

اللہ تعالیٰ کے سامنے ہمہ تن جھکنے والے ہیں۔" (المومنون۔ آیت: ۱تا۲)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ

"بے شک انسان تھوڑ دلا (یعنی تنگ دل اور بے صبر) پیدا ہوا ہے، جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا اٹھتا ہے اور جب اس کو خیر (یعنی مال و دولت، خوشحالی) حاصل ہوتی ہے۔ تو بخل کرنے لگتا ہے مگر وہ نمازی جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں (وہ اس عیب سے محفوظ رہ جاتے ہیں)" (معارج۔ آیت: ۱۹تا۲۳)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ

"بے شک نماز بے حیائی (جس میں بخل بھی شامل ہے) اور برے کاموں سے روکتی ہے۔" (عنکبوت۔ آیت: ۴۵)

نیز اللہ تعالیٰ ایسے نمازیوں کی مذمت کرتے ہیں۔ جن کی نمازوں سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں۔ کہ ان میں رحم اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا جذبہ پیدا نہ کرے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ

"کیا تم نے دیکھا ہے اس شخص کو جو روز جزاء کو جھٹلاتا ہے (یہ) وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں ابھارتا پس تباہی ان نماز پڑھنے والوں کے لئے ہے جو نمازی اپنی نماز (کے نتائج) سے غافل ہیں وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں بھی نہیں دیتے۔" (سورہ ماعون)

یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ "نماز سے غافل" سے مراد وہ شخص نہیں جو نماز نہیں پڑھتا، ورنہ یہ تو مصلی اور نماز پڑھنے والا ہی نہ ہوا۔ بلکہ وہ شخص ہے جو نماز پڑھتا ہے اور یوں ہی

رسمی طور پر پڑھتا ہے۔ جس کی حیثیت نمائشی نماز سے زیادہ نہیں رہتی۔ جس کے اندر عاجزی اور خشوع کی روح کا فقدان ہوتا ہے۔ یہی وہ نماز ہے جو بے روح ہو کر مطلوبہ نتائج برآمد کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بے روح اور بے جان اعمال سے کبھی صحیح نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ ورنہ اگر نماز کے اندر جان ہوتی تو مطلوبہ نتائج ضرور حاصل ہوتے۔

مومن کا روزہ

مومن کا روزہ اس کی صفات شکر، صبر، رحم اور تقویٰ کو ترقی دیتا ہے اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی حدود اور احکامات اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اس معاملہ میں انتہائی محتاط رہے اور اس کی پوری نگہداشت کرے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب نہ ہو جائے۔ پس متقی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ناپسندیدہ چیز سے بچنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔ روزہ میں انسان بھوک، پیاس کو برداشت کرتا ہے۔ یہی چیزیں ایک طرف تو بھوکوں پیاسوں کا احساس دلاتی ہیں تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر دانی اور شکر میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ کیونکہ جب شدت و پیاس نہ ہو تو پانی کی اہمیت کا کیسے اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جب جائز چیزیں موجود ہوں اور اس کا جی بھی چاہتا ہے کہ اسے کھائے پیئے یا استعمال کرے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کھاتا ہے نہ پیتا ہے تو یہ اس کے اندر ضبط اور حق پر جمنے یعنی صبر کی قوت کو بڑھاتا ہے اور خوب پیاسا ہے بھوکا ہے کھانا موجود ہے لیکن پھر بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی حضوری (کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے) کو ترقی دیتا ہے اور جب پاک حلال چیزوں سے رکنے کی مشق ہوتی ہے۔ تو اس کی وجہ سے جو چیزیں حرام ہیں۔ ان سے بچنے کے بارے میں سخت محتاط ہو جاتا ہے۔ سال میں ایک ماہ، ماہِ رمضان اسی اصلاح و تربیت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ تاکہ انسان کی پوری زندگی ایک روزہ دار کی زندگی ثابت ہو جائے اور وہ ہر آن اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں اور حدود کے متعلق محتاط رہے لیکن یہ اس وقت حاصل ہوگا۔ جب روزہ قانون اور رسمی انداز سے نہ رکھا جائے۔ بلکہ بندگی اور احتیاط کی روح سے بھری ہوئی مشق کے ساتھ ہو۔ ورنہ اگر روزہ میں حلال چیزوں کو تو وقتی طور پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن غیبت، دھوکہ دہی، جھوٹ،

افتراء اور کمزوروں پر ظلم اور ان کے خلاف غصہ، گالی گلوچ، تجارت، معاملات میں سود، حرام اور ناجائز کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ علماء سے مسئلہ معلوم کر کے نشہ آور دوائیں انجکشن کے ذریعے جسم میں اتار کر مزہ لیتا رہے۔ تو آخر اس روزہ سے صبر و استقامت، شکر، مہربانی اور تقویٰ کیسے پیدا ہوگا؟

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

"اے ایمان والوں تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ" (بقرہ۔ آیت: ۱۸۳)

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "الصوم لی وانا اجزی به" یعنی روزہ (خاص) میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دیتا ہوں۔" (بخاری و مسلم)

یعنی روزے سے اللہ تعالیٰ، اس کی محبت، اس کا صحیح تعلق اور اس کی خوشنودی ملتی ہے اور یہ اسی لئے ہوتا ہے کہ روزہ کی وجہ سے انسان خالص اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہ جاتا ہے اور اس حالت میں ترقی کرتا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کا ہو جائے گا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

" من کان للہ کان اللہ له "

"جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہ گیا، اللہ تعالیٰ اس کا ہو گیا"

باقی رہے وہ روزے جن کو صرف رسمی طور پر رکھا جائے۔ تو ان سے قطعاً مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ ایسے روزہ داروں کے متعلق جو صرف قانوناً بھوکے پیاسے رہ کر حرام چیزوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ

" من لم يدع قول الزور و العمل به فليس لله حاجة ، ان يدع طعامه وشرابه "

"جو شخص روزہ رکھتے ہوئے باطل کلام اور باطل کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں" (بخاری و مشکوۃ)

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" رب صائم لیس له من صیامه الا الجوع " " ورب قائم لیس له من قیامه الا السهر "

مطلب یہ کہ "بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے ہیں کہ ان کو روزہ (کے ثمرات) میں سے بجز بھوکا رہنے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے راتوں کو قیام کرنے والے ایسے ہیں کہ جن کو (تہجد کے اور راتوں کے) قیام (کے ثمرات میں سے صرف جاگنے (کی مشقت) کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا" (الترغیب والترہیب و مشکوۃ کتاب الصیام)

مگر افسوس یہ ہے کہ بعض بے رحم لوگ امت کو صرف قانونی اور رسمی چیزوں میں الجھائے رکھتے ہیں اور لوگوں کے سامنے اختلافی مسائل چھیڑتے ہیں اور انہی مسائل میں لوگوں کو ایسے الجھاتے ہیں کہ اصل مقاصد عوام کے ذہنوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں وہ غیر ضروری چیزوں کو مقصد بنا کر دین کے مقاصد سے دور ہٹ جاتے ہیں۔ نماز میں قنوت اور خشوع پر نہ زور دیا جاتا ہے، نہ ٹوکا جاتا ہے۔ بلکہ خود دین کے علمبردار ہو کر نماز میں وہ کام کرتے ہیں جو صرف قنوت، خشوع کے خلاف نہیں بلکہ صراحتاً سنت کے خلاف ہیں۔ مثلاً داڑھی سے اور کپڑوں سے اس طرح کھیلتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے نہیں بلکہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہیں اور نماز میں وہ کرتوت کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے سے زیادہ منصب والے کے سامنے تو کیا اپنے برابر کے منصب والوں کے سامنے بھی نہیں کر سکیں گے۔ لیکن پھر بھی آمین بالجہر اور بالسر، ہاتھ کو سینے پر یا اس کے نیچے رکھنا وغیرہ جیسی چیزوں پر لڑتے ہیں اور ان چیزوں پر اپنے لوگوں کو اس طرح پکا کرتے ہیں کہ دوسروں کو کافر، مشرک، بدعتی یا تارک سنت وغیرہ قرار دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے علماء ایسے بھی ہیں کہ وہ عوام کو یہی بتاتے ہیں کہ کیا تمہاری نماز نے تمہارے اندر رحم کی صفت پیدا کی ہے یا نہیں؟ تمہیں فحش، منکرات سے بچایا ہے یا نہیں؟ اور انہیں یہ بھی بتاتے ہیں

کہ تم جب اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوتے ہو تو عاجزی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور عاجزی سے کھڑا ہونا تو ہر کوئی جانتا ہے کہ جس کی ہیبت اور عظمت تمہارے دل پر ہو تو پھر اس کے سامنے تم کیسے کھڑے ہوتے ہو۔ یہی عاجزی کے ساتھ کھڑا ہونا ہے۔ لیکن ایسے علماء امت کی اصلاح کے لئے ناکافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی نماز، روزہ کی توفیق عنایت فرمائے۔

مومن کا حج

حج اللہ تعالیٰ کے عشق ومحبت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ وغیرہ اسلاف کے ساتھ محبت اور اللہ تعالیٰ کی طرف یکسوئی اور رحمان کے بندوں میں باہمی اتفاق واتحاد اور شیطان اور اس کے دوستوں سے نفرت اور ان کے خلاف متفق ہو کر جنگ کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید وقوی تعلق اور محبت پیدا ہونے کا ذریعہ ہے۔

لیکن مسلمان لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں اور واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن کوئی نیا ولولہ لے کر واپس نہیں آتے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے مسلمانوں کو حج کے فروعی مسائل میں الجھا دیا ہے یا صرف حج کے چند قانونی مسائل بتا دیئے ہیں۔ جس کی وجہ سے حج جیسی عشق الٰہی کو بھڑکانے والی اور ایک مرکز پر جمع ہو کر صرف اللہ تعالیٰ رب العالمین سے وابستہ کرنے والی اور ہر باطل سے بیزار رکھنے والی عبادت اور مسلمانوں میں اتفاق واتحاد کرنے والا فریضہ، بے روح بنا دیا گیا ہے۔ مسلمان سارے ایک ہی لباس پہن کر اور یک زبان ہو کر "لبیک اللھم لبیک" کے نعرے لگا کر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنی جان و مال اور دنیا کی ہر چیز کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے دین کی سربلندی کے لئے حاضر ہیں اور اس کی بندگی میں کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ اور اس کے لئے اور اس کے قانون یعنی دین اسلام کے لئے ہر تعریف اور ہر ستائش ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی سرزمین میں اللہ تعالیٰ ہی کے قانون و تعلیم کو غالب کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور تمام کے تمام مسلمان ایک ہی میدان میں جمع ہو جاتے ہیں اور قیامت کا منظر گویا سامنے آ جاتا ہے تو وہ

وہاں پوری لجاجت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں اور ہر باطل کے ظلم، جبر نفس و شیطان کی شکست اور دنیا و آخرت کی فلاح کی دعائیں مانگ کر نفس و شیطان پر حملے کے لئے رات کو پھر ایک دوسرے میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ تیاری کرتے ہیں اور تیاری کے بعد صبح کے وقت پھر دعا کر کے یکبارگی سب سے پہلے جمرۃ العقبہ (بڑے شیطان) کو، پھر دوسرے دنوں میں تینوں کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آثار و علامات، ان کی قربانیاں اور خود نبی کریم ﷺ کی یادگاروں کو دیکھ کر مسلمانوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال اور عزت، غرض ہر قسم کی قربانی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مشاہدہ یہی ہے کہ حج سے واپسی پر حاجیوں کے اندر کوئی ایسا ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔ واپس آ کر شیطان اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں متحد ہو جانے کی بجائے شیطان اور شیطانی قوتوں کے اشاروں پر ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں۔ نہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کی چنگاری بھڑکتی ہے اور نہ مسلمانوں کے ساتھ رحم و خیر خواہی کا جذبہ اور نہ باہمی اتفاق و الفت کی راہیں کھلتی ہیں۔ نہ دین کی خاطر مشقت اور مال و جان کی قربانی کا جذبہ۔ غرض یہ کہ حج جیسا اللہ تعالیٰ اور اسلاف سے والہانہ محبت پیدا کرنے والا عمل اور دین اسلام کے عظیم رکن کو چند مسائل میں گم کر دیا گیا ہے اور ہمارا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ اختلافی مسائل میں ہمارے مسلک پر عمل کیا جائے۔ اس پر حج کے مبارک فریضہ کی ادائیگی کے ایام میں بحث و مباحثے، مناظرے اور جنگ ہوا کرتی ہے اور مقاصدِ حج اور نتائج حج پر زور نہیں دیا جاتا اور فسق و فجور، غیبت وغیرہ سے پرہیز اور حسنِ اخلاق کی تلقین نہیں کی جاتی ہے۔ آخر جب حج ہی کے موقعہ پر جنگ و جدال ہے اور وہاں انہوں نے یہ سبق نہیں سیکھا، تو آخر وہ اپنے ممالک میں واپس کر کیا کریں گے اور جب اس مبارک فریضہ میں ان کی زبانیں فضول گوئی بلکہ غیبت وغیرہ میں مصروف ہوں اور ایک دوسرے کے احترام و اکرام سے ان کے قلوب اور دل خالی ہوں۔ تو واپس آ کر وہ حج کے ثمرات کیسے حاصل کریں گے؟ انہوں نے حج کے اعمال تو ادا کئے لیکن صرف بطور رسم ادا کئے، نہ کہ روحِ عبادت اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ساتھ اور یہ ظاہر ہے کہ نتائج و ثمرات تو

اس وقت حاصل ہوں گے۔ جب کہ عملی ڈھانچہ میں اس کی روح بھی موجود ہو اور بے روح اور بے جان چیزیں تو صرف نمائشی ہوتی ہیں اور بے جان نمائشی اعمال سے نتائج اور ثمرات پیدا نہیں ہو سکتے۔ نتائج تو کیا بلکہ ان سے تو اور زیادہ بگاڑ اور ان سے معاشرہ اور زیادہ بدبودار ہو جاتا ہے۔

دین کے ظاہری اعمال اور حقیقی مقاصد

آپ نے دیکھا کہ دین کے بعض ظاہری اعمال ہیں جن کی وجہ سے آدمی دین کے حقیقی مقاصد تک کامل طور پر پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے ان ظاہری اعمال کی بجا آوری نہایت ضروری ہوتی ہے۔ جب تک قوم دین کا دامن مضبوطی سے تھامے رہتی ہے۔ وہ ظاہری اعمال اور حقیقی مقاصد دونوں کو پیش نظر رکھتی ہے اور دونوں کو یکساں اہمیت دیتی ہے۔ لیکن جب دین کا ولولہ سرد پڑ جاتا ہے تو آہستہ آہستہ حقیقی مقاصد آنکھوں سے اوجھل ہونے لگتے ہیں اور قوم صرف ظاہری اعمال کی ادائیگی کو کافی سمجھنے لگتی ہے اور ان ظاہری اعمال میں حقیقی مقاصد تک پہنچنے کا جذبہ دم توڑ چکا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اعمال بے جان رسوم ہو کر رہ جاتے ہیں اور غلط اندیش قوم انہی رسوم کی بجا آوری کو ہی سب سے بڑی نیکی شمار کرنے لگتی ہے اور حقیقی مقاصد سے یکسر غافل ہو جاتی ہے۔ مثلاً نماز، نمازی کو بدکاری اور بے صبری سے باز رکھتی ہے۔ لیکن جو نماز بدکاری سے باز نہ رکھ سکے تو اس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا۔

" فلم تزده من اللہ الا بعدا "

"پس وہ نماز اللہ تعالیٰ سے اور دور کرے گی" (الحدیث)

روزہ سے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

" من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ و شرابہ "

"روزہ دار اگر جھوٹ بولنے اور اس پر عمل کرنے سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کوئی ضرورت نہیں" (الحدیث)

جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

کے اندر استعمال کرتا ہے۔اس کے خلاف استعمال اور حدود سے ذرہ برابر تجاوز سے ترساں رہتا ہے اور ان تمام چیزوں کے استعمال میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے۔

۳۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق خصوصاً انسانیت کا سخت خیر خواہ ہوتا ہے۔وہ انسانوں کو ملنے والی نعمتوں سے جلنے کی بجائے ان کے اور بڑھ جانے کا خواہاں ہوتا ہے۔اس کی روح دوسروں کی کامیابی سے خوش ہوتی ہے۔

۴۔ اسے عجز و انکساری میں لذت ملتی ہے اور قابو پا کر بھی اپنے ذاتی معاملے میں اپنے حریف کو معاف کرتا ہے۔جب بھی کوئی اس کی غلطی کی نشان دہی کرتا ہے تو اپنی غلطی مان لینے میں اس کا دل ٹھنڈک پاتا ہے۔

۵۔ وہ حقوق کے معاملہ میں اس قدر حساس ہوتا ہے کہ کسی کا حق اس کے ذمہ ہو تو جب تک وہ اسے ادا نہ کرے اسے نیند نہیں آتی۔

۶۔ اور تقویٰ و احتیاط اس کا عمومی مزاج بن جاتا ہے۔جو اس کے تمام معاملات اور اس کے تمام کاموں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔حتیٰ کہ وہ جذباتی مواقع پر بھی محتاط رہتا ہے۔

۷۔ اسے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے۔

۸۔ مومن کا جذبہ یہ ہوتا ہے اور اس کی حالت بھی کہ وہ کردار، حسن اخلاق اور نور ایمان کے لحاظ سے ہر آن اور ہر لمحہ بڑھتا رہتا ہے اور بہتر ہوتا رہتا ہے۔

۹۔ وہ جس ٹھیک کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ہے تو اسے بے دلی سے کبھی نہیں کرتا بلکہ اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ حتی الوسع سپرد کی ہوئی ذمہ داری کو احسن طریقہ سے پورا کرے۔اسی طرح وہ کسی فریضہ اور کسی ذمہ داری کو پوری کوشش اور احسن طریقے کے ساتھ ادا کرتا ہے اور فرض اور ذمہ داری میں کوتاہی کو خیانت سمجھتا ہے۔

۱۰۔ مومن ایک ذمہ دار با اعتبار اور با اعتماد شخصیت ہوتی ہے۔اس کے قول و فعل اور اس کے کردار اور اس کو سونپی ہوئی ذمہ داریوں اور اس کے عہد و پیمان سے لوگ مطمئن

مومن کی صفات وکردار کا خلاصہ

ا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان، آخرت کی زندگی اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ انسان کی زندگی میں انقلاب لاتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے اندر نیا عزم جاگ اٹھتا ہے اور یہی ایمان ویقین انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کی دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکا دیتا ہے۔ اب تک جو ذاتی خواہشات اور دنیاوی مفادات پر چل رہا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کی تعلیمات پر قائم ہوکر رہ جاتا ہے اور اب تک اس کا ارادہ واختیار جس بے راہ روی کے خطوط پر جا رہا تھا۔ پلٹ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند ہوگیا اور اپنی پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک کر صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اختیار کرتا ہے۔ اب وہ صرف اس سے اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے اور صرف اسی سے اس کی امید بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ اب وہ پوری طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات وہدایات کے حوالے اور سپرد ہوتا ہے۔

۲۔ اب وہ اس زمین کے لوگوں کو اور دولت خزانوں کو اور خود اپنی صلاحیتوں، طاقتوں اور اپنے جسم کے اعضاء آنکھ، کان وغیرہ کو اپنی ملک نہیں سمجھتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملک اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ ان تمام چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اختیار کر لیتا ہے اس کی تعلیم اس کے قانون کے مطابق اور بتائی ہوئی حدود

ہوتے ہیں اور اس پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کے سامنے وہ اپنے ایمان اور ایمان داری کو زبان کی حد تک پیش نہیں کرتا بلکہ کردار کے ساتھ لوگوں کے سامنے اپنی ایمانداری کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

۱۱۔ وہ دنیا کی زندگی اور اس کی آرائش وزیبائش کو وسیع تفریح گاہ نہیں، بلکہ وہ اسے ایک آزمائش اور امتحان گاہ سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی فکر، اپنے ارادوں، اپنے جذبات اور اپنے قول وفعل کو ہر لحاظ سے پھونک پھونک کر کے بروئے کار لاتا ہے۔

۱۲۔ اس کا کوئی قدم بے سوچے سمجھے یوں آزادانہ نہیں اٹھتا۔ وہ اپنے آپ کو آخرت کا مسافر سمجھتا ہے۔ اس لئے یہ آخرت کا مسافر اس گزرگاہ (دنیا) کے عیش ولذتوں میں کبھی مشغول نہیں ہوتا اور نہ دنیا کی چیزوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۳۔ اس کی زندگی بھلے اور اچھے اعمال کا مجموعہ ہوتی ہے۔

۱۴۔ وہ بہترین اخلاق کا حامل ہوتا ہے۔

۱۵۔ اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت اور اس کی نافرمانی کے ڈر سے اس کا دل آباد رہتا ہے۔ اس لئے دنیا کے تمام مصائب، مشکلات کو صبر واستقامت سے سر کرلیتا ہے۔

۱۶۔ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے دستور زندگی اور راہ زندگی پر رواں دواں رہتا ہے، وہ ادھر اُدھر نہیں دیکھتا کہ کوئی خوش ہوتا ہے یا خفا وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی راہ اور اس کی بندگی ہی کی راہ پر چلتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی مصیبت، کوئی مشکل اور دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی لالچ اور خواہش اسے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور راہ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتی۔

۱۷۔ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ومجاہدہ سے محبت ہوتی ہے۔ اس لئے اس راہ میں خواہ کتنی مشکلیں پیش آئیں اور کتنی بڑی بڑی رکاوٹیں سامنے آئیں خواہ وہ رکاوٹیں اس کے اندر ہوں یعنی نفس کی خواہش، اس کی چالیں اور مکروفریب وغیرہ یا خارجی رکاوٹیں، غرض جو رکاوٹ راہ حق میں حائل ہوتی ہے، وہ اس کے ساتھ اپنی پوری

کوشش کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔

۱۸۔ ایمان انسان کے اندر غنیٰ اور استغنا پیدا کرتا ہے۔ وہ تنگ دست ہونے کے باوجود ایسا غنی ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے خزانے اسے خاک نظر آتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی ذمہ دارانہ اور امانت دارانہ ہوتی ہے۔

۱۹۔ وہ نمازوں میں اپنی روح اور اپنے پورے شعور اور پورے خشوع وخضوع کے ساتھ جھکتا ہے اور نماز قائم رکھتا ہے اور تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت پڑھتا ہے۔ نماز میں خشوع وخضوع کا اہتمام کرتا ہے۔

۲۰۔ اسی طرح اس کے مال و دولت میں فقیروں، مسکینوں، محتاجوں اور تمام حقداروں کا حصہ متعین ہوتا ہے اور زکوٰۃ اور روح زکوٰۃ کا پابند رہتا ہے۔

۲۱۔ وہ تمام فرائض روزہ، حج وغیرہ کو اس کی روح کے ساتھ ادا کرتا رہتا ہے۔

۲۲۔ اسی طرح وہ تمام حقوق کو ہمیشہ ادا کرتا رہتا ہے اور ہر ذی حق، کا حق اچھی طرح حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرتا رہتا ہے۔

۲۳۔ وہ اپنی خواہشات کو کنٹرول میں رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ اسے صرف حدود کے اندر استعمال کرتا ہے۔ جو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں۔

۲۴۔ وہ خواہش، منکرات اور لغو باتوں اور فضول کاموں سے قطعی پرہیز کرتا ہے۔

۲۵۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو قیمت اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور آخرت کا سرمایہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اپنا وقت لایعنی باتوں اور کاموں میں استعمال کر کے ضائع کرنا اسے ہلاکت معلوم ہونے لگتا ہے۔

۲۶۔ وہ اپنے تمام فرائض کی ادائیگی اور اپنی تمام مصروفیات میں اور رات کی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔

۲۷۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے اور جو منہ سے بات نکالتا ہے اسے سچ کر کے دکھاتا ہے اور اگر بات غلط ہو تو فوراً اپنی غلطی سے رجوع کرتا ہے۔

۲۸۔ وہ عہد و پیمان کا پابند ہوتا ہے اور رہتا ہے۔

۲۹۔ وہ اپنے مال اور کسی کے مال، دل وزبان، آنکھ وغیرہ تمام امانتوں میں خیانت سے سختی سے پرہیز کرتا ہے۔

۳۰۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر برابر جاری رکھتا ہے۔

۳۱۔ وہ حق، رحمت اور عدل کے قیام ونفاذ کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتا ہے۔

۳۲۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ الفت اور محبت سے پیش آتا ہے اور ان کے ساتھ مودت اور محبت اور اخوت وبھائی چارے کا برتاؤ کرتا ہے۔

۳۳۔ اس کی پوری زندگی رحمت، محنت، عدل وانصاف کے اصولوں پر اسلام اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔

۳۴۔ وہ ہدایت وضلالت، حق وباطل، ظلم وانصاف کے درمیان کبھی مصالحت کی کوشش نہیں کرتا۔

۳۵۔ نہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سرکشی ظلم وسربریت میں مداہنت اور تساہل سے کام لیتا ہے۔

۳۶۔ جب تک اپنے دائرہ اختیار میں ہر باطل اور ہر برائی اور ظلم کا سر کچل نہیں دیتا اسے چین نہیں آتا۔

۳۷۔ اس رحمٰن کے بندے کے ارادے اور ہر قول وفعل کے اندر سے رحمت ومہربانی کی خوشبو مہکتی ہے۔

۳۸۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے محبت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ذرہ برابر ظلم ہونے پر بے چین ہو جاتا ہے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۹۔ اگر وہ ظلم کے خلاف کوئی کاروائی کرتا بھی ہے تو وہ بھی سراسر عدل وانصاف پر مبنی ہوتی ہے۔

۴۰۔ وہ کسی انسان کی تحقیر وتذلیل نہ خود کرتا ہے اور نہ اسے برداشت کرتا ہے۔ یہی وہ مؤمن اور مسلم ہے جس پر تمام امور اور تمام باتوں میں اعتماد اور بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس کے ہر قول وفعل وکردار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

۴۱۔ وہ ہر ذی حق کا حق خود بھی حسن وخوبی سے ادا کرتا ہے اور دلوانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

۴۲۔ اس طرح وہ گھر، معاشرہ قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور لوگوں کو عدل وقسط پر لانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے۔

۴۳۔ وہ ہر حال میں گویا اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت میں رہتا ہے۔ ہر کام کرتے وقت بھی اور ویسے بھی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لو لگائے رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ مناجات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

۴۴۔ ظاہر حالت اس کی جیسی بھی نظر آئے۔ وہ اندرونی طور پر گویا جنت کے باغیچوں میں سیر کر کے اپنے بارے میں بالکل بے فکر رہتا ہے۔ اگر اسے کوئی غم لاحق ہو تو وہ غرض یہ کہ مومن ہر حال میں مطمئن اور گھبراہٹ سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی زندگی بھی حسرت زدہ نہیں ہو سکتی۔

۴۵۔ وہ ہر وقت صابر وشاکر رہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اور اس کی محبت میں ڈوبا رہتا ہے۔ پھر بھی اس مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کے آگے اسے پھر بھی اپنا وجود سراپا غلط نظر آتا ہے۔ اس لئے اس کی زبان پر اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ یا اللہ میری کوتاہی اور میری غلطی کو معاف فرما، یہی وہ ایمان اور ایمانی زندگی یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے جس میں انسان کی دنیا وآخرت کی کامیابی ونجات اور انسان کی ترقی کا راز مضمر ہوتا ہے یہی وہ بندگی ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ میں رنگ جاتا ہے یہی وہ انسان ہے جو "عباد الرحمٰن" کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے یہی وہ انسان ہے جو زمین پر اللہ تعالیٰ کے رحم اور عدل وقسط پر مبنی قانون دینِ اسلام کو سچائی سے نافذ کر سکتا ہے۔ اور یہی وہ انسان ہے جو "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہلانے کا مستحق ہے اور ایسے بندگان رحمٰن کے ہاتھوں میں جب اقتدار آجاتا ہے تو اسے نظام خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ایمانی کمزوری کا علاج

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ کامیابی کا راز سچے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مضمر ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کی کمزوری کیسے دور کی جائے اور ہر ایک انسان اپنی ایمانی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں پختگی کیسے پیدا کرلے؟ اور اس میں آگے کس طرح بڑھ جائے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان پہلے خلوص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور اس کے ساتھ ہی صرف اسے نفع ونقصان کا مالک ومختار مان لے اور صرف اسی کے قانون اور اسی کے احکامات اور تعلیمات و ہدایات کے مطابق چلنے میں نفع کا یقین رکھے اور اس کے خلاف کو سراسر ہلاکت سمجھے اور صرف اسی کی تعلیم و ہدایت اور قانون پر بھروسہ کرے اور اس کے مقابل ہر قانون ہر تعلیم اور ہر ہدایت کو زندگی اور منزل مقصود کے لئے زہر قاتل سمجھے اور اس کے ساتھ ہی یہ عزم رکھے کہ آج کے بعد اللہ تعالیٰ کی پوری بندگی اور ایمانی اخلاق وصفات کو اختیار کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد پوری مستعدی کے ساتھ عملی زندگی کو اس پر ڈالنے کی کوشش کرے۔

ایمان کے لئے آزمائش ضروری ہے

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے زعم میں سچی توبہ کرتا ہے اور سچے جذبات کے ساتھ بندگی پر چلنے کی نیت کرتا ہے لیکن جب عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی نیت اور اس کا عزم صرف ایک آرزو اور پانی کے بلبلے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور اس طرح وہ اپنی عملی زندگی میں ناکام ہوجاتا ہے۔ وہ آزمائش اسے بتادیتی ہے کہ تم ایمان میں سچے نہیں تھے۔ حالانکہ انسان کو جاننا چاہئے کہ ایمان کی ترقی اور اس کے نیک ثمرات حاصل کرنے کے لئے آزمائش سخت ضروری ہے اگر آزمائش نہ ہو تو انسان کی اندرونی صلاحیتیں قطعاً ابھر کر نہیں آسکتیں اور اس کا ایمان کبھی تن آور اور مضبوط نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ دانے کے اُگنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے لئے اچھی زمین بنائی جائے اور اسے گرمی

سردی، پانی اور خشکی سے گزار دیا جائے اور اس کے پودے کو جڑی بوٹیوں سے بھی اور جانوروں کے ہڑپ کرنے سے بھی بچایا جائے۔ تو تب جا کر زمین میں پڑنے والا یہ گندم کا دانہ لہلہا اٹھتا ہے اور بار آور ہو جاتا ہے۔

یہی حال دوسرے آم وغیرہ درختوں اور پودوں کا ہے۔ اسی طرح ایمان کے لئے ضروری ہے کہ اسے آزمائش کی بھٹی میں سے گزار دیا جائے۔ اگر واقعی ایمان ہوگا اور دل کی زمین صاف ستھری ہوگی تو یہی آزمائش اسے ترقی دے گی۔ اور صلاحیتوں کو اجاگر کردے گی اس کے دل میں جنت کو بسالے گی اور خارجی دنیا میں اس جنتی شخص کا وجود اللہ تعالیٰ کے بندوں اور مخلوق کے لئے رحمت بن جائے گا۔ ورنہ اگر ایمان نہیں یا دل کی زمین ہی خراب اور دنیا کی گندگیوں جھاڑیوں سے بھری ہے۔ تو ایمان کا یہ کھوکھلا تخم وہیں کا وہیں دب کر ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو (اور ان کے ایمانوں کو) آزمائش میں نہ ڈالا جائے گا (ایسا ہرگز نہیں بلکہ ضرور ان کو دنیاوی آزمائشوں کی بھٹی سے گزرنا ہوگا)" (سورہ عنکبوت۔ آیت: ۲)

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں کو (جانچ کر) الگ نہیں کیا جو (حق کی خاطر اپنے نفس اور ہر رکاوٹ سے لڑ کر) جہاد کرنے والے ہیں اور (تم میں سے ان لوگوں کو بھی جانچ کر) الگ نہیں کیا ہے (ہر حال میں باطل کے مقابلے اور حق پر جمنے اور ثابت قدم رہنے والے) صابروں کو" (آل عمران۔ آیت: ۱۴۲)

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ ایمان کو لازماً دنیا کی آزمائشوں میں پڑنا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ وہ کون سی رکاوٹیں ہیں جو نیت کی راہ میں مزاحم و مقابل ہو کر نیت کو پانی کا بلبلہ بنا دیتی ہیں اور وہ کون سی رکاوٹیں ہیں جو نورِ ایمان کو بجھا کر بالآخر ایمان سے محروم کر دیتی ہیں۔ جس کے بعد انسان صرف نام کا یا بالفاظ دیگر وہ صرف ایک قومی مسلمان رہ جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فلاح و نجات کا دارومدار گروہ بندی یا کسی قوم میں رہنے پر نہیں بلکہ اس کا دارومدار ایمان اور عمل صالح یعنی پوری بندگی پر ہے۔

نیت اور ایمان سے مقابلہ کرنے والی اور لڑنے والی قوتیں

اب نیت اور ایمان سے مقابلہ کرنے اور ٹکر لینے والی قوتوں کو لیجئے۔

۱۔ ہوائے نفس: نفس محنتی اور کٹھن زندگی سے گھبراتا ہے اور لذیذ چیزوں کو محبوب رکھتا ہے۔ خطرات سے دور رہنے کا خواہاں رہتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسروں سے بڑھنے اور زیادہ عزت کے مقام پر رہنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے دوسروں کو زیر کرنے میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ غرض اس طرح کی ساری خواہشات انسان کے اندر پوشیدہ ہیں۔ اگر ان خواہشات کے منہ کو لگام دیا جائے اور انھیں اپنی جگہ پر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے فطری راستوں پر استعمال کیا جائے تو یہی وہ قوتیں ہیں جو انسان کی انسانیت اور اس کی صلاحیتوں اور روحانی قوتوں کو پروان چڑھاتی ہیں اور ترقی کی راہیں اس پر کھول دیتی ہیں۔ جس سے وہ آخرت کی کٹھن زندگی اور مستقبل کے دائمی خطرات سے بچنے کی خاطر دنیا کی محنتوں، مشقتوں اور کٹھن زندگی کا استقبال کرتا ہے مستقبل کی دائمی لذتوں، راحتوں، عزتوں اور آخرت کی دائمی ترقیات کے مقابلے میں دنیا کی عارضی راحت، عارضی لذت و منصب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا کیونکہ وہ عارضی اور تھوڑی اور کمزور لذتوں و مرغوبات اور راحتوں و عزتوں کی بجائے بڑی سے بڑی دائمی لذتوں اور مرغوبات اور راحتوں اور عزتوں کو حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ پھر یہی انسان ہوتا ہے کہ اس مقام سے بڑھ کر وہ

ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید تعلق اور سخت محبت ہوجاتی ہے تو پھر سب سے بڑھ کر اس کی لذت کی چیز اپنے محبوب کی رضا اور خوشی ہوتی ہے اور اس کی ناراضی سے لرزاں وترساں رہتا ہے۔ تو یہ ایک مقام ہے جس کی تعبیر الفاظ میں مشکل بلکہ ناممکن ہے لیکن صرف اتنا سمجھئے کہ وہ ایک ایسی لذت اور چاشنی اور راحت وعزت ہے کہ اس کے مقابلے میں جنت کی دائمی لذتیں وراحتیں ہیچ ہوجاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ نفس کی قوت کو عقل کی لگام لگا کر اسے صحیح جگہ پر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ پر استعمال کیا جائے اور اگر اسے عقل کی لگام نہ لگائی جائے تو نفس عارضی راحتوں، لذتوں اور عارضی امن وغیرہ جیسی مرغوبات کی طرف لپکتا ہے اور نفس کی انہی خواہشات کو ہوائے نفس کہتے ہیں۔ اب جو شخص ہوائے نفس کا اتباع کرے گا تو اس کی نیت، ارادے اور اس کے ایمان میں بھی مضبوطی اور استحکام پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی اچھی نیت کرتا ہے یا کسی واعظ کی نصیحت سے متاثر ہو کر ایمان قبول کرلیتا ہے یا توبہ کا ارادہ کرتا ہے اور توبہ بھی کرلیتا ہے تو اس کی یہ نیت اور اس کا یہ ایمان زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا بلکہ اس کی ادنیٰ سی خواہش اس کے ایمان کو کھوکھلا اور پانی کا بلبلہ ثابت کرتی ہے۔

اس کا طریقہ یہی ہے کہ خواہشات نفس کے ساتھ مقابلہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے حکم اور حق کے مقابلے میں اپنی مرغوبات کو زبردستی ترک کیا جائے۔ جس طرح ڈاکٹر کے بتائے ہوئے پرہیز پر عمل کرنے کی وجہ سے اپنے نفس پر جبر کر کے مرغوبات کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر کا بتایا ہوا پرہیز یقینی نہیں ہوتا۔ اگر بد پرہیزی کی جائے تو دائمی تکلیف بھی نہ ہوگی کہ انسان دنیا کے اس لباس انسانی یعنی اس زندگی سے انتقال کر کے دوسرے لباس اور دوسری دنیا میں داخل ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین کا بتایا ہوا پرہیز انسان کو دائمی صحت یاب بنا کر دائمی خوشیاں نصیب کرتا ہے اور اس میں بد پرہیزی انسان کی دائمی زندگی کو ناسور اور بے چین اور مبتلائے عذاب بنادیتی ہے۔ تو اس کے بتائے ہوئے پرہیز

کی سخت نگہداشت کرنی چاہئے۔ ایک تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا علاج اور پرہیز یقینی ہے دوسری بات یہ کہ یہ دائمی صحت یابی دائمی خوشحالی کیلئے ہے۔ تیسری یہ کہ اس پر عمل نہ کرنے سے دائمی بربادی اور دائمی تکلیفیں ہیں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکامات میں سے پہلے نماز پر خوب محنت کریں اور اس میں نفس کے ساتھ لڑیں۔ نفس نماز کے اندر بھی دنیا کی چیزیں سامنے کرے گا۔ آپ اس کے ساتھ لڑیں اور نماز میں پڑھنے والے الفاظ پر دھیان رکھیں۔ نفس و شیطان خیالات کو بھٹکائیں گے، آپ یہ سوچیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں اور الفاظ پر دھیان رکھیں اور نماز کے اندر خوب وقار سے خوب عاجزی کو اختیار کریں۔ داڑھی اور کپڑوں وغیرہ کو ہاتھ نہ لگائیں اور اپنی نظر بالکل دائیں بائیں سے بچائیں۔ نماز کو اس کے آداب اور پوری روح کے ساتھ ادائیگی کی ہمہ تن کوشش کریں۔

نفس اندر اندر سے طرح طرح کے بہانے بنا کر اس محنت سے جان چھڑانے کی ترغیب دے گا اور کبھی آپ کے سامنے دین کی چیزیں کر کے اس میں کوتاہی پر ابھارے گا، لیکن اس کی قطعاً نہ مانیں۔ اسی طرح روزہ میں غیبت، بدنظری، مشتبہ مال کھانے، استعمال وغیرہ کرنے اور لایعنی باتوں سے مکمل پرہیز کریں کبھی کبھی قریب کے قبرستان میں جائیں اور وہاں کے لوگوں پر نظر کریں۔ آپکی زندگی میں بچے، بوڑھے، جوان بہت سے مرے ہوں گے، تو آپ بھی اپنے آپ کو سمجھائیں کہ ان لوگوں کے پاس دنیا کی کون سی چیز چلی گئی ہے؟ تو اس سے دنیا کی چیزوں سے رغبت کم ہو کر آخرت کی طرف رغبت بڑھتی جائے گی اور سوتے وقت بھی سوچیں کہ ایک دن یہاں سے جانا ہے اور جاگنے کے بعد بھی سوچیں کہ مر کر دوبارہ اسی طرح قبروں سے اٹھنا ہے اور اس کے لئے مسنون دعاؤں کے معنی اور مطلب کو سمجھ کر پڑھنے کا اہتمام کریں۔ وہ آپ کو دعا کے ساتھ موت کی یاد دہانی بھی کراتی رہیں گی۔

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزوں کا حکم فرمایا۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ٹھیک تولنا، ٹھیک بولنا، نظر کی حفاظت، جس کا بیان اوپر گزر گیا۔ اپنے نفس پر جبر کر کے اور اس کے منہ میں عقل کی لگام لگا کر اس راستے پر چلائیں۔ اسی طرح آہستہ آہستہ نفس بھی مطابقت شروع

کردے گا اور بالآخر آپکی عبادات، حقیقی عبادات بن جائیں گی اور آپ کی زندگی بندگی والی بن جائے گی۔ ایسی بندگی والی بن جائے گی کہ خود بندگی آپ سے چپکی جائے گی اور اس بندگی اور پرہیز اور علاج میں آپ راحت وسکون محسوس کریں گے اور اس کے خلاف زندگی آپ کو دشوار لگنے لگے گی۔ یاد رہے کہ نیت اور ایمان کے خلاف جتنی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ یہی ہوائے نفس وشیطان ہے۔ خواہ خلاف حق وہ عادات وروایات ہوں یا طاغوتی قوانین اور قوتوں کی اتباع، یہ صرف انسان کی ہوائے نفس ہی تو ہوتی ہے۔ لیکن ان چیزوں کو مستقل طور پر اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اسے گویا انسان اپنے نفس کے باہر کی چیز سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس کے ساتھ مقابلہ کے لئے بھی تو نفس کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنی عارضی راحت، آرام یا عزت وغیرہ کو ترک کر کے دائمی عزت وآرام پا سکے۔

۲۔ اپنی یا قومی رسم ورواج اور روایات

انسان کی نیت وایمان کے ساتھ مزاحمت کرنے والی چیزوں میں انسان کی اپنی عادت، قوم کی عادت، قوم ومعاشرے کے رسم ورواج اور قومی روایات بھی ہیں۔ ایک چیز کا قوم ومعاشرہ میں رواج ہے۔ لیکن وہ حق اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے خلاف ہے۔ مثلاً صوبہ سرحد میں عام طور پر یہ روایت اور عادت پائی جاتی ہے کہ اگر قریبی رشتہ دار کو اپنی لڑکی نہ دی جائے تو یہی قریبی رشتہ دار اس لڑکی پر پابندی لگا دیتا ہے کہ بس میں ہی اس کا حق دار ہوں کسی دوسرے کے ساتھ اسے بیاہ کرنے کی اجازت نہیں۔ حالانکہ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ لڑکی کی پرورش ماں باپ نے کی ہے پھر وہ ایک زمین یا جانور تو نہیں کہ جسے بھی دے دی جائے، وہ اس کے ساتھ اچھی طرح وقت گزار سکے گا۔ یہ تو انسان ہے جس طرح مرد کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے اور کسی کو نہیں۔ اسی طرح لڑکی بھی انسان ہے۔ جہاں اس کی طبیعت نہ ہو یا جو جگہ اس کے لئے ماں باپ مفید نہیں سمجھتے تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ اس میں دخل اندازی کرے اور جبراً اسے روکے رکھے۔ اب اس واضح اور صریح ظلم ہونے کے باوجود جس کا ظلم ہونا ہر کوئی مانتا ہے پھر بھی جب اس لڑکی سے دوسرا شخص نکاح کرتا ہے تو قومی روایات اور دستور کے مطابق اسے طعن کیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ قریبی رشتہ دار لوگوں کے

طعن سے خوف کھا کر کہ پھر لوگ کیا کہیں گے، وہ اس لڑکی پر پابندی لگا دیتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نکاح نہیں کرے گا۔ اگر کبھی اجازت بھی دیدی جاتی ہے تو پھر بھی بیاہ کرنے والے اور کرانے والے پر جرمانے عائد کیے جاتے ہیں۔ جو سراسر حق کے خلاف ہیں۔ یا مثلاً قریبی رشتہ دار صرف برادری کی بنیاد پر کہتا ہے کہ یہ اس زمین کے حق دار ہیں۔ حالانکہ وہ زمین دوسروں کے ساتھ متصل ہوتی ہے یا جہاں داڑھی منڈانے کا معاشرہ پایا جاتا ہو یا کسی اور بری عادت اور تہذیب کا، تو ایسی صورت میں ایک طرف قومی معاشرہ کی طرف سے طعن اور مذاق اڑانے کا خطرہ رہتا ہے اور دوسری طرف ضمیر کہتا ہے کہ یہ ناحق ہے، ظلم ہے، غلط ہے۔ تو ایسی صورت میں انسان کی نیت اور ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر نیت خالص اور ایمان سچا ہے تو وہ طعن و مذاق کی پرواہ کیے بغیر اس ناحق بات، ناحق روایت و عادت کو چھوڑ دیتا ہے اور اگر نیت و ایمان ہی نہیں تو وہ ایسی روایات و عادات کے مقابلے سے قطعاً عاجز رہتا ہے۔

پس اگر ایک طرف ایسی قومی روایات ہوں کہ اس سے ہٹ کر چلنے پر لوگ آپ پر طعن کرتے یا آپ کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ حق کے سراسر خلاف ہوں، تو ایسی صورت میں آپ لوگوں کے طعن سے بے خوف ہو جائیں۔ یہ نہ دیکھیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ بلکہ یہ دیکھیں کہ حق کیا ہے اور میرے پروردگار نے اس معاملے میں کیا فرمایا ہے تو پھر لوگوں کے بے جا طعن کی پرواہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ تو اس سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک طرف آپ کے ارادے، عزم اور ایمان میں قوت پیدا ہوگی۔ دوسری طرف اگر حق پرست کمزور ہوئے تو آپ کے اس طرز عمل سے انہیں بھی موقع مل جائے گا اور وہ بھی پھر اس طعن، مذاق سے نہیں گھبرائیں گے اور بالآخر یہی ناحق جس پر عمل نہ کرنا باعث طعن تھا اب اس چیز اور روایت پر عمل کرنا باعث طعن اور مذاق بن جائے گا۔

۳۔ ایمان کی راہ میں قوم و برادری کی رکاوٹ

قوم کے ساتھ محبت پھر اس سے زیادہ اپنی برادری سے محبت، یہ فطری ہوتی ہے اور اس محبت والفت کے معاملے میں جو جتنا قریب ہو اس کے ساتھ اتنی زیادہ محبت و ہمدردی

اور خیر خواہی ہونی چاہئے اور دین اسلام میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن انسان کا ارادہ، نیت اور ایمان اس وقت سخت آزمائش میں پڑ جاتا ہے جب قوم اور برادری حق اور ایمان کے مقابلے میں آجائے۔

ایسی صورت میں اکثر یہی ہوتا ہے کہ انسان حق اور ایمان کے تقاضوں کے مقابلے میں قوم اور برادری کو ترجیح دیتا ہے اور قوم و برادری کے لحاظ سے ناحق اور باطل کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ اسلام و ایمان نہیں بلکہ گمراہی اور جہالت ہے۔ ایسی صورت میں انسان حق و ناحق کو نہیں دیکھتا ہے۔ بلکہ قوم یا برادری کا طرف دار ہوتا ہے نیز کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہی تعلقات حق اور ایمان کی راہ میں یوں رکاوٹ بنتے ہیں کہ ایمان اور حق کے تقاضوں اور ایمانی زندگی کی راہ پر چلنے میں قوم و برادری کو چھوڑنا پڑتا ہے یا یہ تعلقات خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں اکثر یہی ہوتا ہے کہ انسان ایمانی تقاضوں پر ان تعلقات کو ترجیح دیتا ہے۔ تو یہ انسان کے نور ایمانی اور قوت ایمانی کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں جب حق اور ایمان کے تقاضوں کے مقابلے میں قوم یا برادری آجائے، یہی سوچیں کہ ہمارے سب سے زیادہ قریب اور ہمارا سب سے زیادہ خیر خواہ اور ہم پر ہر طرح کی نعمتوں اور احسان کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے میرے لئے، میرے والدین و برادری میں محبت رکھ دی اور اسی نے ہمارے فائدے کے لئے جانوروں میں اپنے بچوں کی محبت رکھ دی ہے۔ تاکہ وہ ہمارے لئے ان بچوں کی پرورش کریں اور اس کی رضا میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے اور جو بات اس کی تعلیم اور قانون سے متصادم ہوگی اس میں سراسر ضرر اور نقصان ہے۔

اسی طرح غور و فکر کر کے ہمت کریں اور حسن و خوبی کے ساتھ ایمان اور حق کے تقاضوں کو پورا کر کے آگے بڑھتے جائیں اور امید رکھیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کی فلاح اور کامیابیاں دیں گے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان پر جب باپ کی طرف سے سخت دباؤ بڑھا اور والد نے انھیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باپ کو یوں فرمایا:

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِيًّا

''ابراہیم نے کہا تم پر سلامتی ہو میں اپنے رب سے تمہارے لئے بخشش کی دعا کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر مہربان ہے۔'' (مریم۔ آیت: ۴۷)

قوم و برادری کو چھوڑ کر ان کے جذبات اور کردار یہ تھے۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِيًّا

''اور میں تم لوگوں (کو چھوڑ کر تم) سے الگ ہو جاتا ہوں اور ان سے بھی جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو اور میں تو اپنے رب کو پکاروں گا اور امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا۔'' (مریم۔ آیت: ۴۸)

اور جب انہوں نے حق کی خاطر سب کو چھوڑا تو اللہ تعالیٰ نے کس طرح کا معاملہ فرمایا:

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا

''پس جب وہ لوگوں سے الگ ہو گیا اور ان کے معبودوں سے بھی جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے، تو ہم نے ان کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے اور ہم نے ان میں ہر ایک کو نبی بنا دیا اور ان کو اپنی رحمت کا حصہ دیا اور ہم نے ان کا نیک نام بلند کیا۔'' (مریم آیت: ۴۹ تا ۵۰)

نیز جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ایمان کی تمام آزمائشوں میں کامیابی سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان پر یہ انعام کیا۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا

''اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو اس نے ان کو پورا کر کے دکھایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تم کو سب لوگوں کا امام بناؤں گا'' (بقرہ۔ آیت: ۱۲۴)

غرض ایمان کا تقاضا یہی ہے اور یہی سلیم الفطرتی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ اور اس کا

قانون اور اس کی راہ میں اس کے قانون کے لئے بھاگ دوڑ، جدوجہد اور جہاد ساری چیزوں سے محبوب ہو۔ اللہ تعالیٰ مومن کی صفات بیان کر کے فرماتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

"اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید (سب سے زیادہ) محبت رکھتے ہیں۔" (بقرہ۔آیت:۱۶۵)

اور جو لوگ ایمان کا دعویٰ کر کے بھی قوم و برادری وغیرہ کو حق اور حق کی راہ میں بھاگ دوڑ پر ترجیح دیتے ہیں، ایسی قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ٘اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

"آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور تمہارے مال واسباب جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو یہ سب تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (تمہاری ہلاکت و بربادی کے لئے) اپنا حکم بھیج دے اور (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ فاسقوں کو (سعادت اور کامیابی کا) راستہ نہیں دکھاتا" (توبہ۔آیت:۲۴)

۴۔ ایمان کی راہ میں رکاوٹ طاغوتی اور سرکش قوتیں

نیت اور ایمان سے مقابلہ کرنے والی چیزیں طاغوت اور سرکش قوتیں بھی ہیں۔ اس سے ہر ایسی طاقت وقوت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی مقررہ فطری حدود اور پیمانوں سے آگے نکل جائے۔ خواہ وہ ظالم اور سرکش حکمران ہوں جیسا کہ فرعون، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "اِنَّهٗ طَغٰى" "بے شک (وہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ پیمانوں اور حدود سے آگے نکل کر) سرکش ہوگیا ہے۔" (سورہ طٰہٰ۔آیت:۴۳) خواہ معاشرے کے سرکش

خواتین اور ملکان وسرداران ہوں۔ غرض ہر وہ قوت اور قانون جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرکش ہو چکا ہو۔ اسے طاغوت کہا جاتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

یہ طاغوتی قوتیں انسان کے ارادے اور ایمان کے مزاحم اور مقابل ہوتی ہیں۔ ان کے خوف سے لوگ حق بات کی جرأت نہیں کر سکتے۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی یہ بات یا اس کا یہ قانون رحم، عدل وقسط پر مبنی نہیں بلکہ ظالمانہ ہے۔ لیکن وہ دب کر اس کے خلاف کسی اقدام کا عزم نہیں رکھتے یا کوئی قوم یہ قانون پاس کرے کہ کوئی داڑھی نہیں رکھے گا، تو ایک شخص اسے خوب جانتا ہے کہ اس کا یہ قانون صرف غیر شرعی نہیں بلکہ ظالمانہ بھی ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی حالتِ اضطراری اور مجبوری کی وجہ سے داڑھی نہیں رکھ سکتا تو اس پر زیادہ ملامت نہیں لیکن ایسی صورت میں اکثر یہی ہوتا ہے کہ پھر اندر سے بھی اس غلط قانون کے بدلنے کا عزم ختم ہو جاتا ہے اور بالآخر وہ اس غلط قانون کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اس پر مطمئن ہو کر رہ جاتا ہے اور اپنے ایمان کا جنازہ نکالتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ اگر فلاں ملک یا خان یا سردار یا حاکم سے فیصلہ کراؤں گا تو حق فیصلہ نہیں کرے گا، لیکن پھر بھی اس خیال سے کہ وہ ناراض ہو جائے گا، اس کی طرف اپنا فیصلہ لے جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک عادل شخص موجود ہوتا ہے۔ اسے نظر انداز کرتا ہے یا اس لئے وہ اس سرکش کی طرف فیصلہ لے کر جاتا ہے کہ وہ خود اس معاملہ میں ظالم ہوتا ہے۔ چنانچہ رشوت وغیرہ سے اپنے آپ کو غالب کرانے کے لئے وہاں اپنا فیصلہ لے جاتا ہے تو اسی طرح بھی سرداروں، حکمرانوں وغیرہ کے ڈر سے حق بات پھیلانے سے رُک جاتا ہے اور اپنے ارادوں کو بدل دیتا ہے یعنی اگر مجبوری کی وجہ سے وہ اپنی دعوتِ حق کو عارضی طور پر روکے تو اس پر ملامت نہیں بلکہ ملامت اس پر ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو بدل ڈالے اور اسے طاغوت کے تابع کر دے، تو یہ ساری چیزیں نیت و ایمان کے ساتھ لڑ کر ایمان کو ختم کر کے دفن کر دیتی ہیں۔ لہٰذا جب ایک طرف طاغوت اور سرکشوں کا دباؤ ہو اور دوسری طرف نیت وایمان تو ایسی صورت میں نیت وایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر وہ

کسی صورت حق کے رویے کو نہیں بدلتا اگر چہ وہ طریقوں کو بدلے یا وقتی طور پر اپنے عمل کو روک دے۔ لیکن عزم اور رویہ میں کوئی تبدیلی نہ لائے تو اس سے اس کے ایمان میں ترقی ہو جاتی ہے اور اس کے خوشگوار نتائج اس کو مل جاتے ہیں اور اگر ایسی صورت میں وہ اپنے ارادے ہی کو بدل ڈالتا ہے اور حق کی حمایت سے بالکل دست کش ہو جاتا ہے تو معلوم ہو گیا کہ یہ ایمان نہیں تھا۔ بلکہ وسوسے ایمان تھا۔ جس کو آزمائش نے ثابت کیا کہ یہ سونا نہیں تھا بلکہ سراسر کھوٹ تھا۔ اس لئے وہ اس آزمائش کی آگ سے واپس ہی نہ آسکا۔ ورنہ اگر سونا ہوتا تو آزمائش کی بھٹی میں اور زیادہ چمکدار ہو کر باہر نکل آتا تو اگر یہ صورت پیش آئے تو حق پر ڈٹے رہو، ہر حال میں ظلم و بربریت، ظالمانہ قانون اور برائی کو ختم کرنے کی کوشش کرو۔ کبھی ظلم اور عدل اور حق اور باطل کے درمیان اتحاد و مصالحت نہ کرو۔ بلکہ اس سے لڑنے اور اس کے ساتھ کشمکش میں اپنی کامیابی سمجھو۔ اگر طاغوت بالکل اپنے باطل قانون پر مجبور کرے اور حق کے پھیلاؤ سے روکنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرے تو تم وہاں سے ہجرت کرو۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہتر جگہ اور اسباب وہاں عطا فرمائے گا۔ پھر وہاں جا کر بیٹھو نہیں بلکہ مسلسل ظلم و ناانصافی کے خلاف۔ اور امن و راحت، عدل و قسط کے نظام و قانون کو رواج دینے اور حق کے پھیلانے میں سرگرم عمل رہو۔ اگر ہجرت کی صورت نہیں بن سکتی تو پھر عزم رکھو اور وقت کا انتظار کرو۔ جہاں بھی حق کے اظہار کا موقع ملے وہاں ضرور حق بیان کرو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کے لئے دعوت حق، نفاذ حق کی راہیں کھول دے گا۔ اس آزمائش میں تمہارے ایمان اور روح کی نشوونما بھی ہوتی رہے گی۔ البتہ اس بات کا خوب خیال رکھو کہ اسلام، ایمان یہ سراسر امن و سلامتی ہے۔ یہ کسی کو بھی ایسے کام کی اجازت نہیں دیتا جس کے اندر ذرہ برابر ظلم و فساد کی بو آئے۔ بلکہ مومن و مسلم کے پاس جا کر ہی دوسرا انسان رحم و محبت و الفت اور امن و سکون پانے کی خوشبو محسوس کر لیتا ہے۔

۵۔ نیت اور ایمان کی راہ میں رکاوٹ بننے والی اشیاء حالات بھی ہیں

نیت اور ایمان کی راہ میں رکاوٹ اور روڑے اٹکانے والی چیزیں حالات بھی ہیں (تنگ دستی، خوشحالی، مال و دولت کی فراوانی، اقتدار، غم کی حالت، فائدے کی حالت اور

نقصان کی حالت، جنگ کی حالت وغیرہ)۔ انسان عام حالات میں ٹھیک چلتا ہے اور اس کا خیال ہوتا ہے کہ میرا ایمان بڑا مضبوط ہے اور میں بہت ہی مخلص ہوں لیکن اس کی نیت و ایمان کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب جنگ اور مشکل حالات پیش آئیں۔ تنگ دستی آئے یا اس کو اقتدار ملے یا کوئی مصیبت اور صدمہ پہنچ جائے تو ایسی حالت میں اگر کوئی شخص برابر حق وعدل پر رہتا ہے اور ان حالات کے مطابق احکام پر عمل کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ واقعی اس کی نیت خالص اور اس کا ایمان سچا تھا۔ ورنہ یہ حالات اس کی نیت وایمان کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تیری نیت وایمان صرف آرزوؤں کا مجموعہ تھا۔ اگر اقتدار کی حالت ہو تو یہ بھی بڑی ایمانی آزمائش ہے۔ اس لئے محتاط رہیں کہ ظلم، فخر وغرور اور اقتدار کا نشہ نہ چڑھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرافگندگی، عاجزی، انکساری، رحم وعدل، امانت داری کا احساس اور بڑھ جائے۔ اگر خوشحالی کی حالت ہے تو پھر آپ کی نیت وایمان کی آزمائش لازمی ہے کہ کیا اتراتا ہے؟ اسراف کرتا ہے؟ یا عجز وانکساری اور حقوق کی ادائیگی کا پورا خیال رکھتا ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں تکبر، فخر، غرور اور اسراف سے بچیں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ جتنا آپ اسراف کرتے ہیں، اتنا ہی آپ دوسروں کے حقوق مارتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ مال آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے۔ ان سے آپ کے علاوہ دوسروں کے حقوق بھی وابستہ ہیں اگر تنگ دستی ہو تو چاپلوسی، طمع، ناحق مال کے حصول کی کوشش اور اصولوں پر سودے بازی سے قطعی پرہیز کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے ذلت کا ہاتھ نہ پھیلائیں الّا یہ کہ شریعت سوال کی اجازت دے تو ایسی صورت میں بقدر ضرورت سوال کرنا جائز ہو سکتا ہے مگر ایسی حالت میں اس بات کو یاد رکھیں کہ اس میں آپ کی نیت اور ایمان کی آزمائش ہو رہی ہے اور اس تنگ دستی کے مطابق احکام پر عمل کرنے اور اس میں حق پر جمنے سے آپ کے ایمان اور ارادے میں ترقی ہو جائے گی اور مفید نتائج پیدا ہوں گے۔ لہٰذا پہاڑ سے لکڑی لائیں۔ اس میں اپنے لئے عار محسوس نہ کریں۔ لیکن طمع اور سوال کی ذلت سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ نہ اشارۃً سوال کریں نہ مانگنے کے لئے چالوں کو اپنائیں اور لوگوں کی دولت پر قطعاً نگاہ نہ رکھیں۔ بلکہ خود محنت کریں اور جائز کاموں میں

سے کسی کام کو بھی اپنے لئے عار نہ سمجھیں اور نہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان میں کمی لائیں بلکہ انھی حالات کو اپنے لئے بہتر جانیں کہ شاید اسی میں میری بہتری اور خیر ہے اور اپنے فرائض کی ادائیگی اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں اور امید رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد آسانیاں لانے والا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ موت جس طرح انسان کی خوشحالی، دولت اور فراوانی کو ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح اس کی تنگی کو بھی ملیامیٹ کرتی ہے۔ اسی طرح جنگ کی حالت میں یا جس وقت طاغوتی قوتوں کی طرف سے سختی شروع ہوتی ہے اور قید و بند کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ایسی صورت میں ایمان کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ جنگ کی حالت میں جب کسی کو یہ خوب معلوم ہو جائے کہ جنگ، حق کی جنگ ہے تو ایسی صورت میں کچھ قسم کے کمزور لوگ دیدہ و دانستہ لوگوں کے حوصلے پست کرتے ہیں۔ دوسروں کو بھی جنگ سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ اس کی بزدلی کا راز بھی فاش نہ ہو اور ان کی کمزوریوں پر بدستور پردہ بھی پڑا رہے۔ مثلاً یہ جہاد نہیں، یہ ہے، وہ ہے، حالانکہ انھیں خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہاد ہے اور حق کی جنگ لڑی جاری ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایمان والوں پر طاغوتی حکمران کی طرف سے جبر و تشدد کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور قید و بند کی صعوبتیں سامنے دکھائی دیتی ہیں تو ایسی صورت میں کمزور ارادے اور کمزور ایمان والے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر دوسروں کو گرفتار کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان کی کمزوریاں نمایاں ہوتی ہیں تو اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں کو بدنام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی تیز زبانی اور پروپیگنڈوں سے کام لیتے ہیں اور بھی چیزیں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے ارادے اور ایمان کا اندازہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صرف تمناؤں کا مجموعہ تھا۔ ایسے حالات میں نہ ایمان ہوتا ہے، نہ عزم۔ لہٰذا ایسے حالات میں بھی ہر وقت حق اور حق والوں کی حمایت جاری رکھیں۔ خواہ جنگ کی حالت ہو اور آپ پر یہ بھی واضح ہو کہ یہ واقعی حق کی جنگ ہے اور اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکالیں جس کی وجہ سے جہاد کو نقصان پہنچے یا دوسرے لوگوں کے حوصلے پست ہو جائیں۔ خواہ قید و بند کے حالات اور جبر و تشدد کے حالات ہوں یا حق کی خاطر لڑنے کی

صعوبتیں اور مشکلات کی حالت ہو تو ایسے تمام حالات میں کبھی نہ گھبرائیں اور یہی وقت
آپ کے ابھرنے اور آپ کی صلاحیتوں کے کھلنے کا ہے اسی میں اپنی روحانی ترقیات اور
انسانیت کی ترقی کا راز سمجھیں۔ اس وقت کو غنیمت سمجھیں۔ خود تکلیف سہہ کر دوسروں کو
تکلیف سے نجات دلانے کی کوشش کریں اور اپنی زبان سے کبھی کوئی ایسا کلمہ نہ نکالیں جس
کی وجہ سے حق والوں کو نقصان پہنچے اور بلا وجہ دوسرا بدنام ہو جائے۔ اگر آپ سے
بتقاضائے بشریت کمزوری صادر ہو گئی تو اس کمزوری کو چھپانے کا طریقہ یہ نہیں کہ دوسروں
کی کردار کشی کریں یا دوسروں کے حوصلے پست کریں۔ یہ تو منافق کا شیوہ ہے۔ بلکہ اس کا
واحد راستہ یہی ہے کہ توبہ کر کے حق کی حمایت میں از سر نو کمر بستہ ہو جائیں اور یہی مومن کا
شیوہ سمجھیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو بھی سامنے رکھیں۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً
يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا

''اور جو شخص کسی اچھی بات کے حق میں کہے گا اس کے لئے اس میں حصہ ہے اور جو
کوئی بری بات کے حق میں کہے گا تو اس کے لئے اس میں حصہ ہے'' (نساء آیت: ۸۵)

نیز اس ارشاد کو بھی بار بار ذہن میں لائیں اس پر سوچا کریں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ
قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِيْنَ

''اور کتنے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر اللہ والوں نے جنگ کی (اور ان اللہ
والوں کی حالت یہ تھی کہ) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو مصیبت ان پر پڑی ان سے وہ پست
ہمت نہ ہوئے (اور) نہ انہوں نے کوئی کمزوری دکھائی اور نہ وہ (باطل اور کفر سے) دبے
(بلکہ مسلسل اللہ تعالیٰ اور حق کی خاطر باطل اور کفر کے مقابلے میں ثابت قدم رہے اور

مقابلہ کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ ایسے ثابت قدم رہنے والوں) صابرین کو محبوب رکھتا ہے (اور جب ان پر کوئی مصیبت آئی تو ایسے حالات میں ان کے جذبات اور باتیں یہ نہ تھی کہ اس کے ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے اور دوسروں کے سر الزام تھوپ دیتے بلکہ اپنی طرف متوجہ ہو جاتے اور ان کے دلی جذبات جو الفاظ بن کر ان کی زبان پر آتے تھے وہ یہ تھے کہ) ان کی زبان سے اس کے سوا کچھ اور نہ نکلا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے کام میں ہم سے جو زیادتی (اور جو کمزوری) ہوئی اس کو معاف فرما اور ہم کو (ہر حال میں حق پر) ثابت قدم اور منکر حق قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما تو اللہ تعالیٰ نے (ان حق والوں اور خدا پرستوں) کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی (اور یہی بدلہ اللہ تعالیٰ محسنین[1] یعنی جن کے اعمال اخلاص کے پیکر ہوتے ہیں کو دے دیا کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ محسنین کو محبوب رکھتا ہے۔" (آل عمران۔ آیت: ۱۴۶ تا ۱۴۸)

---

[1] یاد رہے "محسن" نہ تو اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ بظاہر نیک عمل کرے اور نہ اس کو کہا جاتا ہے کہ جو صرف نام کا مخلص ہو بلکہ "محسن" وہ ہے جس کے اعمال اخلاص سے بنے ہوتے ہوں اور اس کا کردار اخلاص کا پیکر ہو۔

شکست اور فتح یا فائدہ اور نقصان کی حالت میں ایمان کی جانچ اور ایمان والوں کا کردار

جو لوگ حق کی خاطر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں یا باطل قوتوں کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور حالات ایسے ہوں کہ بظاہر حق والے کم ہوں تو ایسی صورت میں جن لوگوں پر حق واضح ہو جاتا ہے۔ ان میں اکثریت ایسوں کی ہوتی ہے کہ دنیاوی مفادات کو نہیں چھوڑ سکتے تو ایسی حالت میں کمزور لوگ حالات پر نظر رکھتے ہیں کہ جس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور پھر اس میں آگے دوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ اب فتح و کامیابی اور سیاست و اقتدار کا تاج اس کے سر کو دیا جائے اور جب حق پر کبھی کمزوری کی وجہ سے کوئی نقصان آتا ہے تو بجائے اس کے کہ حق کی کسی بھی طرح حمایت کریں، وہ الٹا باطل کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ انھیں خوب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناحق ہے اور اس طرح وہ اپنے نیک ارادے اور ایمان کو ضائع کر دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں خوب جان لیں کہ آپ کی آزمائش اور امتحان ہو رہا ہے کہ آپ پر حق واضح ہو جانے کے بعد آپ کا کردار کیا ہے؟ اگر آپ کمزور ہیں تو حوصلہ رکھیں اور اس قلیل اور حقیر دنیا کی خواہشات، مفادات کو یک لخت نظر انداز کر کے حق کی حمایت کی جو استعداد آپ میں ہے، اسی کے مطابق اس کی حمایت کریں۔ کیونکہ صلاحیتوں اور استعداد کے لحاظ سے لوگوں میں تفاوت پایا جاتا ہے تو آپ اپنے آپ کو حق کی تائید کے لئے پیش کریں اور جو کام آپ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں، اس کو فی الحال شروع

کریں اوراس کے بعد آہستہ آہستہ قربانی کے لحاظ سے ترقی کریں تو انشاء اللہ تو یا ایمان اور قوت ایمان میں اضافہ ہوگا۔ نیز کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں یا جنگ میں بظاہر حق والوں کو کوئی شکست یا نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ کے ستر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین جو قرآن کے حفاظ اور قراء تھے ان کو سازشیوں نے شہید کردیا۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رِعل، ذکوان، عصیہ اور بنو لحیان قبیلے کے لوگوں نے بظاہر مسلمان بن کر رسول اللہ ﷺ سے اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لئے ایسے آدمی طلب کئے جو (تبلیغی جدوجہد میں) ان کی مدد کرسکیں اور ان کو قرآن مجید اور سنت الرسول ﷺ کی تعلیم بھی دیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ستر انصار جو اپنے زمانے کے قراء کہلاتے تھے، ان کے ساتھ کردیئے۔ جب یہ لوگ بیر معونہ کے مقام پر پہنچے تو ان لوگوں نے بدعہدی کی۔ جو عہد انھوں نے نبی کریم ﷺ سے کیا تھا اسے توڑ دیا اور اس بدعہدی اور سازش کی وجہ سے سوائے دو صحابہ کے باقی تمام کو شہید کردیا گیا۔ اور جو صحابی بچ گئے تھے ان میں سے ایک نے پہاڑ کی چوٹی میں پناہ لی اور بچ کر نکل آئے۔ دوسرے حضرت عمرو بن ضمری رضی اللہ عنہ تھے جن کو کافروں نے گرفتار کرلیا (پوری تفصیل کے لئے دیکھیں بخاری کتاب المغازی اور کتاب الجہاد اور مسلم کتاب الامارۃ)

بلاشبہ تقریباً ستر قراء[1] علماء اور صحابہ کرام کا نقصان بہت عظیم تھا اور نبی کریم ﷺ کو بھی بہت صدمہ پہنچا تھا لیکن یہی نقصانات ہوتے ہیں جو بالآخر رنگ لاتے ہیں۔ حق پر جمنے والے کا خون کبھی ضائع نہیں ہوتا۔

نیز دیکھئے احد میں عارضی طور پر مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ستر جلیل القدر صحابہ کرام شہید ہوگئے اور فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ ایسی صورت میں ایمان سخت آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ فتح کے موقعہ پر اور کامیابی کے موقعہ پر جنگ میں جو لوگ شریک ہوں، جس نے کسی بھی طرح اس جنگ میں حصہ لیا ہوتا ہے تو وہ چاہتے ہیں کہ لوگ کہیں گے کہ

---

[1] یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جو قراء ہوتے تھے وہ عالم ہوتے تھے یعنی قرآن مجید کو جاننے والے ہوتے تھے۔

گویا ساری فتح تو اس نے حاصل کر لی ہے لیکن جب بظاہر کوئی نقصان اور شکست کی صورت آتی ہے تو ہر کوئی کوشش کرتا ہے کہ غلطی دوسرے کے سر ڈال دے اور دوسرے کو بدنام اور اپنے آپ کو پاک اور صاف بتلانے کی کوشش کرے۔

میں نے والد ماجد دامت برکاتہم سے بار بار یہ بات سنی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ شراکت کا کاروبار کرتے ہیں حساب کتاب کے بعد دیکھیں کہ اگر وہ آپس میں لڑ رہے ہوں تو سمجھو کہ انہوں نے نقصان کیا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہر کوئی دوسرے پر دھوکہ، خیانت وغیرہ کا الزام تھوپنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی حالت میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ ان کا ایمان انھیں ان باتوں کی اجازت نہیں دیتا لیکن ان پر ایک مایوسی چھا جاتی ہے اور باطل سے کشمکش کا تصور ہی دل سے نکل جاتا ہے نیز جنگ وغیرہ میں منافقین کی شکست کی چند مثالیں قرآن مجید سے پیش کرتا ہوں تاکہ منافقین کا رویہ اچھی طرح واضح ہو جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ منافقین کے بارے میں فرماتے ہیں

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

”وہ منافق جو تمہارے لئے انتظار میں رہتے ہیں اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر منکرین حق کو (فتح و کامیابی میں سے) مل جائے تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی (ان کے اندر کام کر کے) ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا“

(نساء۔ آیت:۱۴۱)

مطلب یہ ہے کہ منافق اپنے فائدے ،دنیا کے مال و جاہ یا عزت کا بندہ ہوتا ہے۔ اسے اپنی عزت یا مال و جاہ کا جہاں بھی فائدہ نظر آئے تو اپنا رشتہ وہاں جوڑ لیتا ہے خواہ وہ اہل حق کے ساتھ ہو یا باطل کے اور منکرین حق کے ساتھ اسے اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ تو وہ اگر حق کے ساتھ رہتا بھی ہے تو دنیا کی خاطر، تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور ایمان نہیں

ہوتا اور ان کے دعوائے ایمان کو فتح ونقصان کی حالت جھوٹا ثابت کرتی ہے۔

فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُمْ بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ أُولَئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ

"پس جب خوف (وجنگ) پیش آتا ہے تو تم (ان کی حالت کو) دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں (خوف وہراس سے) اس شخص کی طرح گردش کر رہی ہیں جس پر موت کی بے ہوشی طاری ہو پھر جب خطرہ دور ہو جاتا ہے (اور کوئی فتح، مال وغنیمت حاصل ہوتا ہے) تو وہ خیر (مال وعزت اور منصب) کی حرص میں (ان کی زبان قینچی کی طرح تیز چلتی ہے اور) تم سے تیز زبانوں کے ساتھ ملتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر اپنے کارنامے بیان کرتے ہیں یہ لوگ (اللہ تعالیٰ پر) ایمان لانے والے نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال اکارت کر دیئے (اور رائیگاں کرائے گئے)"

(احزاب۔آیت:۱۹)

۳. وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا

"اور جو شخص خطا کرے یا گناہ پھر اس (خطا وگناہ) کی تہمت (اور الزام) کسی بے گناہ پر لگائے تو اس نے اٹھایا (بوجھ) بہتان کا اور کھلے گناہ کا"

(النساء۔آیت:۱۱۲)

مطلب یہ ہے کہ گناہ اور خطاء کے بعد تو ایک سلیم الفطرت انسان نادم اور شرمسار ہو کر اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طالب ہوتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے۔لیکن جس شخص نے اپنی فطرت کو مسخ اور اپنے ضمیر کو گندہ کر دیا ہے تو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہ کا یا خطاء کا الزام دوسرے کے سر تھوپ دیتا ہے یا اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی خاطر یا اپنے گناہ وخطاء کو ہلکا کرنے کے لئے دوسرے کے سر بھی اس گناہ اور خطاء کو تھوپ دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کمینہ کون ہو سکتا ہے؟ ایسا شخص گناہ پر گناہ اور ظلم پر ظلم کرتا ہے۔ایک خود اپنے

خطاء اور گناہ کا جرم، دوسرا دوسروں پر بہتان باندھنے اور دوسروں پر ظلم کرنے کا جرم۔ ان جیسے حالات میں ان سے بھی زیادہ کمزور وہ لوگ ہوتے ہیں جو باطل کو یہ یقین دہانی کراتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی سے تمہارے ساتھ تھے اور ان کے اندر رہ کر سب کچھ تمہارے لئے کرتے تھے۔ تو یہ تمام لوگ دنیاوی مفادات مال اور عزت وجاہ کی خاطر آخرت کو برباد کرتے ہیں۔

غرض ایسے حالات میں یعنی نقصان اور شکست کی حالت میں ارادے اور ایمان سخت آزمائش میں پڑ جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ایمان کا تقاضا اور ایمان داروں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ خود افواہیں اڑاتے ہیں اور نہ دوسروں کے جھوٹے پروپیگنڈوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ بلکہ ایسے حالات میں وہ دوسروں کو غلط افواہوں سے روکتے ہیں اور کسی پر الزام دھرنے کے بجائے۔ وہ لوگوں کے حوصلوں کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔ باطل کو زیر کرنے کے طریقے سوچتے ہیں۔ ایسے حالات میں ان پر مایوسی نہیں طاری ہوتی بلکہ ان کا ایمان اور نکھر جاتا ہے۔ یہ تنبیہات ان کی صلاحیتوں کو مفلوج نہیں کرسکتیں، بلکہ یہ ان کی ہمت کے گھوڑوں کے لئے چابک کا کام دیتی ہیں۔ ان کی وجہ سے ان کی ہمت، محنت اور قوت اور تیز ہو جاتی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ سرگرم عمل ہوتے ہیں اور یہ عارضی شکست یا نقصان ایسے ایمانداروں کے لئے زندگی کے قیمتی اسباق اور ان کی قوتوں کی نشوونما، ترقی اور تربیت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

لہذا جب ایسے حالات پیش آجائیں تو آپ کو چاہئے کہ دنیا کے عیش و آرام کو حقیر خیال کر کے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو اپنے سامنے رکھیں، اور فوری طور پر نقصان یا شکست کو ذکر دے اور فتح میں تبدیل کرنے کی کوششوں میں اور تیز ہو جائیں۔ جو نقصان ہوا، شکست ہوئی اس پر غور کریں۔ جہاں جہاں کمی یا کوتاہی ہوئی ہو اس سے بچیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی بچائیں اور اس راہ میں ہونے والی کمی، کوتاہیوں پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کا حسن ظن اور بڑھے کہ انشاء اللہ یہ شکست یا نقصان اپنے اندر عظیم فتوحات اور فوائد لئے ہوئے ہیں۔ دیکھیں بچے جب چلنا سیکھتے ہیں تو گرتے پڑتے ہیں۔

بولنا سیکھتے ہیں تو الٹا سیدھا بولتے ہیں۔ لیکن یہی گرنا پڑنا ان کو چلنا اور دوڑنا یا دوڑ میں اپنے آپ کو سنبھلنے کا طریقہ اور ہنر سکھاتا ہے نیز ایسے نقصانات کے ذریعے خود جماعت کے اندر سے کھوٹے لوگ دور ہو جاتے ہیں یا ان کی پہچان ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ بہت ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ

''اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ (قومی رواجی) مومنوں کو (بغیر آزمائش کے) اسی حالت پر چھوڑ دے جس طرح کہ تم اب ہو، جب تک ناپاک (یعنی منافق اور صرف قومی مسلمانوں) کو طیب اور پاک (یعنی سچے اور پاک مومنوں) سے جدا نہ کرے۔'' (آل عمران۔ آیت:۱۷۹)

یعنی یہ بات تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے دستور کے خلاف ہے کہ جو جماعت تمام لوگوں کی فلاح واصلاح کا ذریعہ بننے والی ہے وہ اسی طرح، خام، پختہ، صالح اور فاسد کا ملغوبہ بنی رہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ آزمائش لاتا ہے تا کہ مخلصین اور سچے مومن ابھر کر سامنے آئیں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھیں اور جو فاسد اور منافق قسم کے لوگ ہوں، ان کا اچھی طرح امتیاز ہو سکے اور یہ بات بھی یاد رہے کہ صرف قومی مومن اور رواجی مومن اور وہ مسلمان جس کے اندر رحم اور امانت داری اور حق پر صبر واستقامت کے جوہر موجود نہ ہوں وہ کبھی انسانوں کو راحت نہیں پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے زندگی میں یہ سخت امتحانات ضرور ہوتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو کردار کی بجائے باتونی منافق لوگ سامنے آئیں گے۔ کیونکہ کمزور اور منافق لوگوں کی باتیں بہت تیز ہوتی ہیں اور ان کے دعوے بہت بلند ہوتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں اگر آپ تحقیق کریں، تو بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کو زور خطابت کی قوت کے ساتھ کردار بھی حاصل ہو اور اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جن کی تقریریں تیز اور کردار سست ہوتا ہے۔ اب اگر آزمائش نہ ہو تو یہی باتونی تیز زبان اور کردار کے بیکار لوگ دین کے اور ملت کے بزرگ بن جائیں گے اور لوگوں کی خدمت پر

انہی کو لگایا جائیگا۔ جن کی ظاہری شان وشوکت اور باتیں زیادہ پرکشش ہوں۔ تو ایسی صورت میں بیک وقت کئی نقصانات ہوں گے۔

۱۔ لوگوں کی خدمت نہ ہوگی اور ان میں رحم وعدل کا نظام برائے نام ہوگا۔

۲۔ زیادہ استعداد اور صلاحیتوں والے لوگوں کو خدمت کا موقع نہیں ملے گا جن کی وجہ سے صرف ان لوگوں کی حق تلفی نہ ہوگی بلکہ پوری انسانیت کے ساتھ ظلم ہوگا۔

۳۔ ایسے لوگ جماعت میں رہ کر جماعت کے لئے آستین کے سانپ بن جاتے ہیں اور یہ کمزور لوگ کسی وقت بھی اپنے حقیر مفادات کی خاطر سودا بازی کر کے پوری جماعت کو ڈبو دیں گے یا جماعت میں رخنہ ڈال دیں گے۔

۴۔ ایسے لوگ جماعت میں ہوں جن کی زبانیں تیز اور کردار ست ہو تو انھیں دیکھ کر لوگ حق سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اسلام سے بدظن ہو جاتے ہیں۔

۵۔ ایسی صورت میں جبکہ جماعت میں منافق بھی ہوں اور ان کی پہچان بھی نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں حق و باطل گڈ مڈ، خلط ملط ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہو اور وہ اس میں خلط ملط رہے تو ایسی صورت میں حق، کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

۶۔ اور جب آزمائش نہ ہو تو انسان کی صلاحیتیں قطعاً ابھر کر سامنے نہیں آسکتیں اور نہ ان کی صلاحیتوں کی تربیت اور نشو ونما ہو سکتی ہے اور نہ لوگوں میں صبر واستقامت کا جوہر پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تو انسانیت کی پیدائش فضول اور بیکار ہو جاتی ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ غرض یہ کہ ایسے امتحانات اور تنبیہات جو آتی ہیں ان کے بارے میں سوچیں کہ یہ خود ایمانداروں کی تربیت و پاکیزگی، جماعت کی پاکیزگی اور ان میں جو سچے ہیں ان کی صلاحیتوں، قوتوں کو بڑھانے اور کچے اور کمزوروں کے چھانٹنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور انہی آزمائشوں میں پاس ہونے والا فرد اور جماعت، دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ایسی جماعت اپنے قول وفعل سے لوگوں کے سامنے گواہ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور پوری انسانیت کے لئے رحمت کا باعث بن جاتی ہے۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان

آزمائشوں سے گھبرا جائے بلکہ ان آزمائشوں کا تو استقبال کرنا چاہیے۔ البتہ گھبرانے کی چیز یہ ہے کہ انسان ان آزمائشوں میں فیل ہونے سے گھبرائے اور جو لوگ آزمائش میں فیل ہوجانے سے خوفزدہ ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے لوگ امتحان اور آزمائش میں اچھی طرح پاس ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا بیان کردہ علاج کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب کوئی شخص حق پر چلنے کی نیت کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے تو اس کی نیت اور ایمان کی جانچ شروع ہوجاتی ہے۔ عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق اور زندگی کے ہر قدم پر اس کی جانچ شروع ہوجاتی ہے اور اس کے لئے دین کی راہ میں اپنی نفسانی خواہشات، اپنی عادات، قومی عادات اور روایات، فائدے اور نقصان کے حالات، جنگ و صلح کے حالات، فتح و شکست کے حالات اور دنیا کے فائدے اور مصلحتیں، مصائب، حق کی خاطر اپنی برادری قوم کو چھوڑنے اور عزت و منصب ختم ہوجانے جیسی بڑی بڑی مشکلات حائل نظر آتی ہیں، لیکن اگر انسان صرف اتنا سوچ لے کہ یہ ساری چیزیں بالکل عارضی اور وقتی ہیں اور اس کے مقابلے میں بہترین دائمی، لازوال خوشیاں، راحتیں، عزتیں ملتی ہیں اور دنیا میں بھی حقیقی سکون چین و راحت، دلی اطمینان، پاکیزہ زندگی ملتی ہے۔ تو اسے ان تکالیف، مشکلات اور نفس و شیطان اور طاغوت سے مقابلہ میں لذت و چاشنی، ملنے لگے گی اور بادشاہوں کے تاج کھلونے اور دنیا کی طاقتیں اس کے سامنے مکڑی کے جالوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھیں گی۔ بس ان تمام صورتوں اور حالات میں حق پر جم کر تعلق مع اللہ، اللہ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے میں اور اسکا استحضار اور لوگوں کے ساتھ احسان، امانت داری، عدل و انصاف اور ایمان جیسے اوصاف و کردار جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ان میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آخرت کی جنتی زندگی سے پہلے پہلے اپنے دل میں جنتی زندگی کو پاؤ گے۔ جو آپ سے کوئی قید و بند، کوئی حالت، کوئی طاغوت نہیں چھین سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا عشق و محبت اور اس کی مرضی و خوشنودی میں اپنی مرضی اور ارادوں کو فنا اور ختم کرنے کی توفیق عنایت فرمائے اور اپنی خوشنودی کی لازوال نعمت سے مالا مال کردے۔

روحانی صحت کی علامت اور پہچان

یہاں اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ انسان کمزور ہے۔ وہ خواہشات نفس، شریعت کے خلاف عادات و روایات، تہذیب اور طاغوت کا جب مسلسل مقابلہ کرتا ہے تو اس میں کبھی کبھی انسان کمزور پڑ جاتا ہے اور نفس وغیرہ یہ چیزیں اس پر غالب آجاتی ہیں اور اس سے لغزش ہو جاتی ہے۔ تو ایسی صورت میں پھر توبہ کریں اور جدوجہد کو جاری رکھیں۔ پھر لغزش ہو جائے پھر اٹھیں اور اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں اور کبھی بھی مجاہدے اور جدوجہد کی راہ کو نہ چھوڑیں۔ اگر نفس اور طاغوت کے ساتھ کشمکش ہر وقت جاری رکھنے کی کوشش کریں گے تو راستے کی ٹھوکریں جن کے بعد فوراً اٹھنا ہو اور توبہ و اصلاح کا پورا عزم اور پھر لغزش کی پوری تلافی ہو تو یہ آپ کے ایمان کی صحت یابی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے آخر میں فرماتا ہے کہ:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ

"اور اللہ تعالیٰ کو محسنین بہت پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان سے کبھی فحش کام سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں (تو فوراً انہیں اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے) تو وہ اس سے (اپنی لغزشوں کی) معافی مانگتے ہیں کیونکہ (ان کو یقین ہوتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور (ان کی یہ لغزش وقتی اور عارضی ہوتی ہے اس لئے وہ) دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔"

(عمران۔ آیت: ۱۳۵ تا ۱۳۶)

غرض یہ کہ جو شخص ایمان کی صفات، اخلاق اور کردار اور ذکر و فکر، اسلامی اعمال کو اس کی روح کے ساتھ (جس کا بیان گزر چکا) پوری کوشش کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ اپنے نفس اور حالات کے ساتھ مقابلہ کر کے مجاہدہ کرتا ہے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کا ایمان بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ پھر یہی چیزیں تکلف کے ساتھ نہیں بلکہ یہ اس کے اخلاق بن جاتے ہیں اور اچھے اعمال رحم و عدل، امانتداری، ہمدردی، ارادے، قول اور اعمال خود بخود اس سے نکلنے لگتے ہیں۔ کچھ عرصہ تکلف اور اپنے نفس وغیرہ سے مجاہدہ کے بعد پھر تکلف کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جس طرح چشمے سے خود بخود بغیر تکلف کے پانی نکلتا ہے اور آم کے درخت سے آم اور سورج سے روشنی، اسی طرح انسان سے ایمانی اخلاق، ایمانی کردار اور اللہ تعالیٰ کی بندگی خود بخود ٹپکنے لگ جاتی ہے۔

اچھی صحبت کی ضرورت

اپنی مرضی اور ارادہ کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں گم کرنے اور ختم کرنے اور ایمان کو مضبوط بنانے اور برابر بڑھاتے رہنے کے لئے اچھے ایمان دار متقی لوگوں کی زیادہ سے زیادہ صحبت اکسیر ہے۔ اس سے انسان کے اندر جدوجہد کا شوق اور اچھے اعمال و کردار کا شوق بڑھ جاتا ہے اور اچھے اور متقی لوگوں سے ایمانی رنگ حاصل ہوتا ہے اور صحبت کا اکسیر ہونا ایک ایسی مسلمہ چیز ہے کہ اس کے ثبوت و ضرورت کو سب نقل کرتے ہیں۔ تو جس طرح محسن، متقی، ایماندار لوگوں کے ساتھ محبت انسان کے لئے بہت مفید اور بہترین علاج ہے۔ تو اسی طرح بُری صحبت بہت ہی سخت خطرناک اور اس کے نتائج بہت ہولناک ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی خوب کوشش کریں کہ نیک ایماندار سچے لوگوں اور متقی لوگوں کی صحبت کو اختیار کریں اور یہ یاد رکھیں کہ کتاب، ریڈیو کی بھی ایک صحبت ہے۔ اس کے بھی اچھے اور بُرے اثرات ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر بری چیز کے سننے اور دیکھنے سے پرہیز کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ایمان اور بندگی، باطل کی آمیزشوں سے پاک رہے گی۔

آخری گزارش

اب آخر میں چند اہم باتوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ان کو اپنانے کی کوشش کریں۔

۱۔ نفع ونقصان کا مالک صرف ایک اللہ تعالی رب العالمین ہے۔اس کے سوا کوئی بھی نفع ونقصان کا مالک ومختار نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ نفع اللہ تعالی کے قانون اور اس کی تعلیم وحکم کے مطابق چلنے سے ملتا ہے اور اس کے حکم وتعلیم کی خلاف ورزی میں سراسر نقصان وضرر ملے گا۔

۳۔ اللہ تعالی کے قوانین اور اس کی تعلیم وہدایت پر چل کر نفع کی امید رکھیں اور اس کی تعلیم وہدایت کی خلاف ورزی سے خوف زدہ ،لرزاں وترساں رہیں۔

۴۔ اللہ تعالی کی بندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ انسان کی اندرونی فطری قوتوں کی نشوونما کرتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان اللہ تعالی کی صفات کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اور انسان کے اندر رحم وعدل ،امانت داری ،صبر وشکر ،حیاء ،عفت ،استغناء وغیرہ جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں۔

۵۔ نماز ،روزہ ،ذکر واذکار وغیرہ جیسی عبادات ان اخلاق وصفات میں پختگی پیدا کرتی ہیں اور اس میں مزید ترقی کا باعث بنتی ہیں۔اگر اس کی وجہ سے یہ پختگی اور ترقی نہ ہو تو سمجھو کہ ان عبادات میں کوئی نہ کوئی نقصان ہے یا صرف بطور رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس لئے ان عبادات اور نظامِ تزکیہ کا بڑا اہتمام کرنا چاہئے اور اس کے نتائج پر کڑی نظر رکھنی چاہئے اور یاد رہے کہ اس نظام کا مطلب ہواؤں میں اڑنا نہیں اور نہ ہی کشف قبور وغیرہ سے اس کا تعلق ہے اور نہ اس کا تصوراتی اور خیالی ترقی بچا نرم وغیرہ سے کوئی جوڑ ہے بلکہ اس سے بغض ،حسد ،تکبر ،چاپلوسی وغیرہ جیسے رذائل کا ازالہ

ہو جاتا ہے اور اس سے تعظیم لامر اللہ رحم، صبر، شکر، امانت داری، حیاء وعفت وغیرہ جیسے اخلاق کی آبیاری ہوتی ہے اور انہی صفات کی وجہ سے انسان کی روحانی ترقی ہوتی ہے۔

۶۔ ایمان اور بندگی اور اس سے پیدا ہونے والے پائیدار اور ابدی اچھے نتائج کے لئے ضروری ہے کہ آزمائش ہو۔ خوشحالی وتنگی، غم وخوشی اور امن وخوف، جانی ومالی نقصانات اور لوگوں کے پروپیگنڈے وغیرہ جیسے حالات آئیں گے۔ لیکن ان چیزوں سے قطعاً نہ گھبرائیں یہ آپ کے تخمِ ایمان کے لئے کھاد ہیں۔ جو اس میں اور قوت پیدا کریں گے۔ البتہ اس سے خوف زدہ رہیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی مانگیں کہ کہیں ان آزمائشوں میں فیل نہ ہو جاؤں اور یہ خیال رکھیں کہ ہر حالت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہو اس پر سختی سے عمل کرنے کی کوشش کریں۔

۷۔ اگر کسی آزمائش کی وجہ سے آپ سے لوگ کٹ گئے اور آپ کی جماعت پہلے کی نسبت کم رہ گئی تو اس سے بھی قطعاً نہ گھبرائیں۔ ایسا ضروری بھی ہے۔ کیونکہ گندم کے دانے جب پک جاتے ہیں تو پھر ہمیں یہی بتایا گیا ہے کہ گندم کو بھوسہ سے نکالنے کے لئے تمام کٹی ہوئی فصل پر بیل، ٹریکٹر یا تھریشر وغیرہ چلائیں اور اسے ہوا میں اڑائیں تا کہ گندم وبھوسہ علیحدہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کا یہی قانون جماعتِ حقہ کے لئے بھی ہوتا ہے کہ ان پر ایک آزمائش لاتا ہے۔ تا کہ اس جماعت میں سچوں کو جھوٹوں سے الگ کر دیا جائے اور اس آزمائش میں سچوں کی صلاحیتیں اور قوتیں مزید ابھر کر سامنے آجاتی ہیں اور ان کا کھوٹ اور کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں اور جو جھوٹے اور کھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ جماعت سے پھینک دیئے جاتے ہیں اور جماعت صاف ستھری ہو کر رہ جاتی ہے۔ تا کہ وہ اپنے قول وعمل سے دوسرے انسانوں کے لئے گواہ اور رہنما بن سکیں۔ عارضی مفادات، عارضی لذت، عارضی خوشی، عارضی عزت ومنصب کے مقابلہ میں اور اختلافات کے مواقع میں ہر چیز سے بالاتر ہو کر صرف حق کی جستجو اور حق کے متلاشی رہیں تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانون کے مطابق

حق کی یہی جستجو اور حق کے لئے یہی بے چینی آپ پر حق وہدایت کی راہوں کو کھول دے گی۔

۸۔ اگر کبھی جذبات سے مغلوب ہو گئے یا اب تک آپ نے توبہ نہیں کی اور اصلاح کی وہ راہ اختیار نہیں کی ہے تو مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عفو و درگزر کا قانون بھی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب کسی پودے کو کچھ وقت پانی اور کھاد نہ ملے تو وہ مرجھا جاتا ہے۔ کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کی جڑیں بالکل خشک نہ ہوں تو اسے اگر پھر سے پانی دیا جائے اور کھاد ڈالی جائے تو وہ پودا پھر سے ترقی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی بد پرہیزی کرتا ہے۔ بیمار ہوتا ہے۔ اگر وہ پھر سے پرہیز شروع کر دے اور علاج کرے تو صحت مند ہو جاتا ہے، بشرطیکہ وہ زندہ ہو۔ اسی طرح جب انسان کا ضمیر زندہ ہو تو اسے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ سابقہ روش کو چھوڑ کر راہِ حق اور بندگی کی طرف پلٹ آئے اور پھر بندگی کی راہ اور اعمال صالحہ کو اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق پہلے گناہ مٹ جائیں گے اور اس کی انسانیت اور روحانیت پھر سے سرسبز ہو کر دنیا و آخرت کی فلاح کی راہ پر رواں دواں ہو جائے گی۔

باقی رہی یہ بات کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ضمیر زندہ ہے تو اس کا اندازہ لگانا بہت آسان ہے۔ وہ یہ کہ اگر آپ کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی بندگی کی طرف رجوع موجود ہے یا بالفاظ دیگر اگر آپ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور سابقہ گناہوں اور روش پر نادم ہیں تو یہی ضمیر کی زندگی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو آپ کی اندرونی انسانیت کے زندہ ہونے کی علامت ہے اور جس کا ضمیر مردہ ہو اور اس کے اندر کا انسان مر چکا ہو تو اس کے اندر نہ تو حق کی جستجو باقی رہ جاتی ہے اور نہ اس کے اندر ندامت اور نہ اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون و حکم کی خلاف ورزی کا خوف باقی رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو نہ توبہ کی توفیق مل سکتی ہے اور نہ وہ توبہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے اور سچی توبہ اور اصلاح کی توفیق سے نوازے۔

۱۱۔ بری صحبت مثلاً جھوٹے، غیر ذمہ دار، ظالم اور بدگمان، بدزبان، غیر معتدل اور بے

رحم، خائن، متکبر، دنیا پرست وغیرہ جیسے لوگوں کی صحبت سے اور ان کی دوستی ومحبت سے دور رہیں۔ البتہ انسانیت سے ہمدردی کے ناتے انھیں برابر حق کی طرف بلاتے رہیں اور انھیں ظلم اور بے حیائی وغیرہ جیسے کاموں سے منع کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

غرض یہ کہ ہر بری صحبت سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں اور ایسے لوگوں کی صحبت کا اہتمام کریں جو متقی یعنی سچے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی حدود اور اس کے احکامات اور ہدایات کے بارے میں سخت محتاط ہوں۔ جن کے ساتھ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جدوجہد کی محبت بڑھے اور آخرت کی فکر پیدا ہو۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ،
ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

بندہ مختار الدین،
خادم تحریک ایمان وتقویٰ،
جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ